وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا.

ترجمہ: ''اور مضبوط پکڑو رسی اللہ کی سب مل کر۔'' (آل عمران آیت ۱۰۳)

خیر کا راستہ

قرآنی آیات اور احادیث کے شہ پارے جسے پڑھنے کے بعد بھٹکا ہوا انسان تمام پرفتن راستوں کو چھوڑ کر خیر کے راستہ پر چلنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔

جمع و ترتیب

اراکینِ نظام ایجوکیشن سوسائٹی (رجسٹرڈ)

ناشر

نظام ایجوکیشن سوسائٹی (رجسٹرڈ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

”انتساب“

یہ کتاب اللہ رَبُّ العالمین کے محبوب، محسنِ انسانیت، سرکارِ دوعالم، رَحْمَةُ اللِّعالمین، نبیِ آخِرُ الزَّماں، احمدِ مجتبیٰ، محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم، کے نام منسوب کی جاتی ہے جنہوں نے ہمیں جینے کا قرینہ سکھلایا۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدِنِ النَّبِّی الْاُمِّیِّ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَسَلِّم.

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات میں انسان کو بہترین شکل وصورت میں پیدا فرما کر اسے اشرف المخلوقات کے منفرد اعزاز سے نوازا اور ساتھ ہی فلاحِ دارین کے حصول، امن وسلامتی اور کامیاب زندگی بسر کرنے کا طریقہ بتلانے کے لئے مختلف اوقات و مقامات میں حسب ضرورت انبیاء کرام مبعوث فرمائے، جن کی تعلیماتِ عالیہ پر عمل پیرا ہو کر خوش نصیب انسان کامیابی و کامرانی کی شاہراہ پر ہمیشہ چلتے رہے، اور ہر نبی نے اپنے اپنے دورِ نبوت میں بھرپور انداز سے انسانیت کی رہنمائی کا اہم فریضہ سر انجام دیا۔ سب سے آخر میں اللہ تعالیٰ نے پوری انسانیت کی رشد و ہدایت اور رہنمائی کے لئے اپنے پیارے حبیب، امام الانبیاء، احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور اپنا پسندیدہ اور آخری دین، دینِ اسلام، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط سے انسانیت کی فوز وفلاح کے لئے منتخب فرمایا، اور اس میں انسان کی عملی زندگی کے لئے ایسے راستے متعین فرما دیئے جن پر چل کر انسان آسانی کے ساتھ اپنی منزل تک پہنچ جائے، وہ راستے کیا ہیں؟

زیرِ نظر کتاب میں اراکینِ نظام ایجوکیشن سوسائٹی نے بڑی محنت وخلوص سے قرآنِ کریم کی ہدایات، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات، اسلام کے بنیادی ارکان، کلمہ، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد فی سبیل اللہ جیسے اہم مضامین پر روشنی ڈال کر ان راستوں کی نشاندہی مختلف مستند کتابوں کی مدد سے کی ہے، جن پر چل کر انسان دارین کی فوز وفلاح سے مالا مال ہوسکتا ہے۔ میں نے یہ کتاب از اول تا آخر پڑھی

ہے اور اپنے علم وفہم کے مطابق اس کو صحیح اور عوام الناس کے لئے نافع پایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات سے قوی امید ہے کہ وہ اس کتاب کو شرفِ قبولیت سے نوازتے ہوئے عوام الناس کی ہدایت و رہنمائی و اصلاح اور مرتبین کے لئے نجاتِ اخروی کا ذریعہ بنائیں گے، میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کی نشر واشاعت اور کسی بھی درجہ میں معاون بننے والے افراد کو اپنی شایانِ شان جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمِ
وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمِ

(مولانا) **محمد اعجاز** (صاحب)
استاذ الحدیث جامعہ امینیہ للبنات نرسری کراچی
مدیرِ معاون ماہنامہ "بینات"
جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ مرتب

اللہ جل شانہٗ نے انسان کو دنیا میں اشرف المخلوقات بنا کر بھیجا اور اُسے دو راستے دکھا دیئے۔ ایک خیر کا راستہ اور دوسرا شر کا راستہ۔ اُسے یہ بھی بتا دیا کہ خیر کا راستہ تمہیں نجات کی طرف لے جائے گا اور ربّ العالمین کا دیدار کرائے گا (جو ہمارے لئے سب سے بڑا اعزاز ہے)۔ اور شر کا راستہ تمہیں گمراہی کی طرف لے جائے گا اور جہنم کے گڑھوں میں دھکیل دے گا۔

اُس عظیم ربّ العالمین نے ہمیں خالی ہاتھ نہیں بھیجا، بلکہ اپنے محبوب نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہماری راہنمائی کے لئے قرآنِ کریم نازل فرمایا اور ہمیں بتا دیا کہ یہی قرآن تمہیں خیر کی طرف لے جائے گا۔

تو کیوں نہ ہم اِس بے مثال کتاب کا سہارا لیں جس میں ہماری عافیت اور راہنمائی موجود ہے۔ (لیکن بصیرت شرط ہے)۔

اللہ کے بندو! اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھامو! ہمیں منزل مقصود (جنت) تک پہنچانے کا یہی واحد سہارا ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے یہ ادنیٰ سی کوشش کی ہے، اگر اس کوشش سے لوگوں کو کتابِ الٰہی کی طرف رجوع ہونے کی توفیق نصیب ہوجائے تو انشاء اللہ ہماری محنت وصول ہوجائے گی۔

اللہ ربُّ العزت سے التجا ہے کہ ہماری اس ادنیٰ سی کاوش کو قبول فرما کر ہمارا خاتمہ ایمان پر فرمائیں اور صالحین کے ساتھ ہمارا حشر فرمائیں اور اس کتاب کو ہمارے والدین اور عزیز و اقارب کی مغفرت اور رفع درجات کا ذریعہ بنا دیں۔ آمین۔

مرتبین

اراکینِ نظام ایجوکیشن سوسائٹی (رجسٹرڈ)

فہرست مضامین

صفحہ	عنوان
۱۳	بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
۱۳	ہر کام کو بسم اللہ سے شروع کرنے کی حکمت
۱۵	بسم اللہ کی تفسیر
۱۷	اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو
۱۷	ربطِ آیات
۲۲	قرآنِ کریم
۲۲	تاریخ نزولِ قرآن
۲۳	حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نزولِ وحی کے طریقے
۲۷	قرآنِ کریم کی فضیلت
۳۵	اندھیروں سے نکالنے اور روشنی میں لانے کا واحد ذریعہ
۳۷	ہدایت صرف اللہ تعالیٰ کا فعل ہے
۳۷	احکام و ہدایات
۳۸	قرآنِ کریم کی تلاوت بھی مستقل مقصد ہے
۴۰	خلاصۂ مفہوم
۴۳	نُزولِ سکینہ
۴۳	سکینہ کی تین تفسیریں
۴۴	نورِ سکینہ کے حصول اور حفاظت کا طریقہ
۴۵	نزولِ سکینہ از دیادِ ایمان یعنی نسبتِ خاصہ کا ذریعہ ہے
۴۶	ایمانِ عقلی، استدلالی، موروثی و ایمانِ ذوقی حالی و وجدانی کی تمثیل

صفحہ	عنوان

عنوان	صفحہ
ذکرُ اللہ سے نزولِ سکینہ کی دلیلِ نقلی اور ایک علمِ عظیم	۴۷
سورۂ فاتحہ کے فضائل اور خصوصیات	۴۹
مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ	۵۰
روزِ جزاء کی حقیقت اور عقلاً اس کی ضرورت	۵۰
مالک کون ہے؟	۵۲
ہدایت کے درجات کی تفصیل	۵۴
صراطِ مستقیم منعم علیھم کا راستہ ہے	۵۸
انعام یافتہ بندے کون ہیں؟	۵۸
نبی کی تعریف	۵۹
شہید کی تعریف	۵۹
صالحین کی تعریف	۵۹
اولیاء اللہ میں سب سے بڑا درجہ صدّیقین کا ہے	۵۹
صدّیقین کی تعریف	۶۰
جس کا قال اور حال ایک ہو	۶۰
جس کا باطن ظاہری حالات سے متاثر نہ ہو	۶۱
دونوں جہان خدا پر فدا کرنے والا	۶۱
جنت کے خزائنِ خاص کی دو آیتیں	۶۳
ان دو آیتوں کے خاص فضائل	۶۴
مسلمان کے عقائد	۶۸
عقیدۂ توحید	۶۹
"لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" کی فضیلت	۷۲
شرک کی قباحت	۷۶
نماز	۸۳

عنوان	صفحہ
نماز کی فضیلت	۸۵
بے نمازوں کو تنبیہ	۸۸
روزہ	۹۲
روزہ کی حکمت	۹۳
گناہ چھڑوانے کا موثر نسخہ	۹۳
❶ مراقبہ	۹۴
❷ صبر کی مشق	۹۴
❸ نماز	۹۴
❹ تلاوت	۹۴
❺ نقلِ محبت	۹۵
❻ کوشش اور دعا	۹۵
❼ جسمانی ضعف	۹۵
❽ شیاطین کا مقید ہوجانا	۹۵
❾ موت کی یاد	۹۶
❿ عقلی تربیت	۹۶
زکوٰۃ	۹۷
فضائلِ زکوٰۃ	۹۸
زکوٰۃ کی تاکید میں چند آیات	۹۸
زکوٰۃ کی تاکید میں چند احادیث	۹۸
زکوٰۃ ادا نہ کرنے کی وعید میں چند احادیث	۹۹
حج	۱۰۱
حج کی ترغیب میں چند آیات	۱۰۲
حج کی ترغیب میں چند احادیث	۱۰۲

صفحہ	عنوان

۱۰۳	حج کی حقیقت ....
۱۱۶	زیارتِ مدینہ ....
۱۱۹	جہاد ....
۱۱۹	جہاد کی فرضیت چند قرآنی آیات کی روشنی میں ....
۱۲۱	جہاد کی فرضیت چند احادیثِ شریفہ کی روشنی میں ....
۱۲۳	ان لوگوں کیلئے بعض وعیدوں کا بیان جو جہاد کو چھوڑ دیں، اس سے پہلو تہی کریں یا بغیر جہاد کے مر جائیں........
۱۲۴	چند احادیث........
۱۲۵	اے مسلمان تجھے کس چیز نے جہاد سے روک رکھا ہے؟ ....
۱۲۹	نورِ ایمان کے اجزائے ترکیبی ....
۱۲۹	نورِ فطرت اور نورِ وحی ....
۱۳۰	نور کی تعریف ....
۱۳۱	نورِ مومن ....
۱۳۴	اولوا الالباب کے ایمان کی کیفیت ....
۱۳۴	آیت کا شانِ نزول ....
۱۳۹	بندۂ مومن کی شخصیت کے خدوخال ....
۱۴۲	اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کی مخصوص صفات و علامات ....
۱۴۸	احکامِ دین کا صرف مطالعہ کافی نہیں بلکہ اسلاف کی تفسیر کے مطابق سمجھ کر عمل کرنا ضروری ہے ....
۱۵۱	تعمیرِ سیرت کی اَساس ....
۱۵۲	فضائل وخصوصیات سورۂ مؤمنون ....
۱۵۳	فلاح کیا چیز ہے، کہاں اور کیسے ملتی ہے؟........
۱۵۴	مومن کامل کے وہ سات اوصاف جن پر آیاتِ مذکورہ میں فلاحِ دُنیا وآخرت

صفحہ	عنوان
	کا وعدہ ہے ....
۱۵۵	نماز میں خشوع کا درجہ ....
۱۵۸	تین چیزوں کا حکم اور تین چیزوں کی ممانعت ....
۱۶۴	عہد شکنی حرام ہے ....
۱۶۶	مسلمانوں کیلئے چند اہم وصیتیں ....
۱۶۶	پہلی وصیت......صبر ....
۱۶۷	دوسری وصیت......مصابرہ ....
۱۶۷	تیسری وصیت......مرابطہ ....
۱۷۰	سماجی اور معاشرتی اقدار ....
۱۷۱	ربطِ آیات ....
۱۷۱	حکم اول توحید ....
۱۷۱	حکم دوم ادائے حقوقِ والدین ....
۱۷۱	والدین کے ادب واحترام اور اطاعت کی بڑی اہمیت ....
۱۷۲	والدین کی حق تلفی کی سزا آخرت سے پہلے دنیا میں بھی ملتی ہے ....
۱۷۶	اپنی اور اپنے اہل وعیال کی اصلاح کی فکر کرنا ....
۱۷۷	بیوی اور اولاد کی تعلیم وتربیت ہر مسلمان پر ضروری ہے ....
۱۸۳	اشخاص وافراد کے باہمی حقوق اور ایذا رِسانی سے اجتناب ....
۱۸۷	بعض القاب کا استثناء ....
۱۸۸	اچھے القاب سے یاد کیا جائے ....
۱۸۹	اللہ نرمی رکھتا ہے اپنے بندوں پر اور رزق دیتا ہے جس کو چاہے ....
۱۹۲	غفلت کا سبب دنیا حاصل کرنے کی دھن ....
۱۹۶	سورۃ التکاثر کی خاص فضیلت ....
۱۹۷	لوازمِ نجات (سورۃ العصر کی روشنی میں) ....

عنوان	صفحہ
سورۂ عصر کی خاص فضیلت	۱۹۷
زمانے کو نوعِ انسانی کے خسارے میں کیا دخل ہے؟........	۱۹۸
نجات کے لئے صرف اپنے عمل کی اصلاح کافی نہیں بلکہ دوسرے مسلمانوں کی فکر بھی ضروری ہے	۲۰۰
بندوں کے حقوق کا تحفظ اور آخرت میں جزا کا ملنا........	۲۰۲
آخرت، قیامت اور مُردوں کا زندہ ہونا	۲۱۹
خلاصۂ تفسیر........	۲۲۰
معارف ومسائل	۲۲۴
اللہ تعالیٰ انسان سے اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے اس کی تحقیق .	۲۲۴
ہر انسان کے ساتھ دو فرشتے	۲۲۶
اعمالنامہ لکھنے والے فرشتے........	۲۲۷
انسان کا ہر قول ریکارڈ کیا جاتا ہے........	۲۲۸
سکرات الموت	۲۳۰
انسان کو میدانِ حشر میں لانے والے دو فرشتے	۲۳۱
مرنے کے بعد آنکھیں وہ سب کچھ دیکھیں گی جو زندگی میں نہ دیکھ سکتی تھیں	۲۳۲
یہ دنیا ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے	۲۳۵
تقدیر کا ماننا بھی شرطِ ایمان ہے	۲۴۷
تقدیر کے مختلف مدارج........	۲۵۱
مسئلہ تقدیر کے متعلق بعض شبہات کا ازالہ	۲۵۲

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

ترجمہ: ’’شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان اور نہایت رحم والے ہیں۔‘‘

اس پر تمام اہلِ اسلام کا اتفاق ہے کہ ’’بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ‘‘ جو سورۂ نمل میں ہے یہ قرآنِ کریم کا جزو ہے۔ اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ سوائے سورۂ توبہ کے ہر سورت کے شروع میں بسم اللہ لکھی اور پڑھی جاتی ہے جو کہ دو سورتوں کے درمیان فصل کے لئے آتی ہے۔

اہلِ جاہلیت کی عادت تھی کہ اپنے کاموں کو بتوں کے نام سے شروع کیا کرتے تھے، اس رسم جاہلیت کو مٹانے کے لئے قرآنِ کریم کی سب سے پہلی آیت جو جبرئیلِ امین علیہ السلام لے کر آئے، اس میں قرآنِ کریم کو اللہ کے نام سے شروع کرنے کا حکم دیا گیا۔ جیسا کہ ارشاد ہے۔ ’’اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الَّذِیۡ خَلَقَ.‘‘

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ’’ہر وہ کام جو بسم اللہ سے شروع نہ کیا جائے وہ بے برکت رہتا ہے۔‘‘

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ: گھر کا دروازہ بند کرو تو بسم اللہ کہو، چراغ گل کرو تو بسم اللہ کہو، برتن ڈھکو تو بسم اللہ کہو، کھانا کھانے، پانی پینے، وضو کرنے، سواری پر سوار ہونے اور اترنے کے وقت بسم اللہ پڑھنے کی ہدایت احادیث میں بار بار آئی ہے۔

ہر کام کو بسم اللہ سے شروع کرنے کی حکمت

اسلام نے ہر کام کو اللہ کے نام سے شروع کرنے کی ہدایت دے کر انسان کی پوری زندگی کا رخ اس طرف پھیر دیا ہے کہ وہ قدم قدم پر اس حلفِ وفاداری کی تجدید

کرتا رہے کہ میرا وجود اور میرا کوئی کام بغیر اللہ تعالیٰ کی مشیت و ارادے اور اس کی مدد کے نہیں ہوسکتا۔ اسلام نے ہر نیک کام کے شروع میں بسم اللہ کا حکم دے کر انسان کی ہر نقل و حرکت اور تمام معاشی و دُنیوی کاموں کو بھی ایک عبادت بنا دیا۔

دیکھئے عمل کتنا مختصر ہے کہ نہ اس میں کوئی وقت خرچ ہوتا ہے اور نہ محنت و ریاضت، لیکن فائدہ کتنا کیمیاوی اور بڑا ہے کہ دنیا بھی دین بن گئی۔

ایک کافر بھی کھاتا پیتا ہے اور ایک مسلمان بھی، مگر مسلمان اپنے لقمے سے پہلے بسم اللہ پڑھ کر یہ اقرار کرتا ہے کہ یہ لقمہ زمین سے پیدا ہونے سے لے کر تیار ہونے تک، جس میں آسمان و زمین اور سیاروں اور ہوا و فضائی مخلوقات کی طاقتیں، پھر لاکھوں انسانوں کی محنت سے جو تیار ہوا ہے۔ اس کا حاصل کرنا میرے بس میں نہ تھا، اللہ ہی کی ذات ہے جس نے ان تمام مراحل سے گزار کر یہ لقمہ یا گھونٹ مجھے عطا فرمایا ہے۔

مومن و کافر دونوں سوتے جاگتے بھی ہیں، چلتے پھرتے بھی ہیں، مگر مومن سونے سے پہلے اور بیدار ہونے کے وقت اللہ کا نام لے کر اللہ کے ساتھ اپنے رابطے کی تجدید کرتا ہے، جس سے یہ تمام دُنیوی و معاشی ضرورتیں ذکرُ اللہ بن کر عبادت میں لکھی جاتی ہیں۔

مومن سواری پر سوار ہوتے ہوئے بسم اللہ کہہ کر گویا یہ شہادت دیتا ہے کہ اس سواری کا پیدا کرنا یا مہیا کرنا، پھر اس کو میرے قبضے میں دے دینا، انسان کی قدرت سے باہر ہے۔ رَبُّ العزت ہی کے بنائے ہوئے نظامِ محکم کا کام ہے کہ کہیں کی لکڑی، کہیں کا لوہا، کہیں کی مختلف دھاتیں، کہیں کے کاریگر، کہیں کے چلانے والے، سب کے سب ہماری خدمت میں لگے ہوئے ہیں، چند پیسے خرچ کر کے کیا اتنی بڑی خلقِ خدا کی محنت کو ہم اپنے کام میں لا سکتے ہیں؟ اور وہ پیسے بھی جن کے ذریعہ ہم ان سواریوں پر سوار ہوتے ہیں، ہم اپنے ساتھ کہیں سے نہیں لائے تھے، بلکہ اس کے

حاصل کرنے کے تمام اسباب بھی اسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔

غور کیجئے کہ اسلام کی صرف اسی ایک مختصر سی تعلیم نے انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا؟ اس لئے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ ''بسم اللہ'' وہ نسخۂ اکسیر ہے جس سے تانبے کا نہیں، بلکہ خاک کا سونا بن جاتا ہے۔

مسئلہ: قرآن کی تلاوت شروع کرتے وقت اول ''اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ'' اور پھر ''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' پڑھنا سنت ہے اور دورانِ تلاوت بھی سورۂ برأت کے علاوہ ہر سورت کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا سنت ہے۔

بسم اللہ.....کی تفسیر

بسم اللہ کا کلمہ تین لفظوں سے مرکب ہے ایک بآ، دوسرا لفظ اسم، تیسرا لفظ اللہ۔ ''با'' حرف جر ہے اور محض دو کلموں کو ملانے کے لئے آتا ہے اس لئے اس سے پہلے فعل ''اَشْرَعُ'' محذوف نکالتے ہیں اور یہ ''با'' عربی زبان میں بہت سے معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

1. مصاحبت یعنی کسی چیز کا کسی چیز سے متصل ہونا۔ اس اعتبار سے ''بسم اللہ'' کے معنی ہوئے ''شروع کرتا ہوں اللہ کے نام کے ساتھ۔''
2. استعانت یعنی کسی چیز سے مدد حاصل کرنا۔ اس اعتبار سے ''بسم اللہ کے معنی ہوئے شروع کرتا ہوں اللہ کے نام کی مدد سے۔''
3. تبرک یعنی کسی چیز سے برکت حاصل کرنا۔ اس اعتبار سے ''بسم اللہ'' کے معنی ہوئے ''شروع کرتا ہوں اللہ کے نام کی برکت سے۔''

''الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں۔ رحمٰن کے معنی عام الرحمۃ اور رحیم کے معنی تام الرحمۃ کے ہیں۔ عام الرحمۃ (وہ ذات جس کی رحمت سارے عالم اور ساری کائنات اور جو کچھ اب تک پیدا ہوا ہے اور جو کچھ ہوگا، سب پر

حاوی اور شامل ہے)۔

اور تام الرحمۃ (جس کی رحمت کامل ومکمل ہو) یہی وجہ ہے کہ لفظ رحمٰن اللہ جل شانہٗ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے۔ کسی مخلوق کو رحمٰن کہنا جائز نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی ایسا نہیں ہوسکتا، جس کی رحمت سے عالم کی کوئی چیز خالی نہ رہے۔ اسی لئے جس طرح لفظ ''اللہ'' کا ''جمع'' اور ''تثنیہ'' نہیں آتا، اسی طرح لفظ ''رحمٰن'' کا بھی ''جمع وتثنیہ'' نہیں آتا۔ کیونکہ یہ لفظ ''رحمٰن'' ایک ہی ذاتِ پاک کے ساتھ مخصوص ہے۔

مسئلہ: اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ آج کل عبدالرحمٰن اور فضل الرحمٰن وغیرہ ناموں میں تخفیف کر کے رحمٰن کہتے ہیں اور اس شخص کو اس لفظ سے خطاب کرتے ہیں، یہ ناجائز وگناہ ہے۔

(معارف القرآن جلد اول)

﴿وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ط اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ۝﴾ (سورہ الاعراف: ۱۷۰)

ترجمہ: ''اور جو لوگ خوب پکڑ رہے ہیں کتاب کو اور قائم رکھتے ہیں نماز کو، بے شک ہم ضائع نہ کریں گے ثواب نیکی والوں کا۔''

اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑو!

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ص وَاذْکُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَاءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖ اِخْوَانًا ج وَکُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَکُمْ مِّنْھَا ط کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمْ اٰیٰتِہٖ لَعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ﴾ (آل عمران:۱۰۳)

ترجمہ: ’’اور مضبوط پکڑو رسّی اللہ کی سب مل کر اور پھوٹ نہ ڈالو اور یاد کرو احسان اللہ کا اپنے اوپر جب کہ تھے تم آپس میں دشمن، پھر الفت دی تمہارے دلوں میں، اب ہوگئے اس کے فضل سے بھائی، اور تم تھے کنارے پر ایک آگ کے گڑھے کے، پھر تم کو اس سے نجات دی، اِسی طرح کھولتا ہے اللہ تم پر آیتیں تا کہ تم راہ پاؤ۔‘‘

ربطِ آیات

سابقہ آیات میں مسلمانوں کو اس پر تنبیہ کی گئی تھی کہ اہلِ کتاب اور دوسرے لوگ جو تمہیں گمراہی میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں، ان کی گمراہی سے باخبر رہ کر بچنے کا اہتمام کرو، مذکورہ دو آیتوں میں مسلمانوں کی اجتماعی قوت کو مضبوط، نا قابلِ تسخیر بنانے کے دو اہم اصول بتائے گئے ہیں۔

1. تقویٰ۔
2. باہمی اتفاق واتحاد اور تفرق واختلاف سے بچنا۔

”وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا“ یعنی اللہ کی رسّی کو سب مل کر مضبوط تھامو۔

اللہ کی رسّی سے مراد قرآن مجید ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ راوی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ”کِتَابُ اللّٰہِ ھُوَ حَبْلُ اللّٰہِ الْمَمْدُوْدُ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ“ یعنی کتابُ اللہ، اللہ تعالیٰ کی رسی ہے جو آسمان سے زمین تک لٹکی ہوئی ہے۔ (ابن کثیر)

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں ”حَبْلُ اللّٰہِ ھُوَ الْقُرْآنُ“ کے الفاظ آئے ہیں۔ (ابن کثیر)

محاورۂ عربی میں حَبْل سے مراد عہد بھی ہوتا ہے اور مطلقاً ہر وہ شے جو ذریعہ یا وسیلہ کا کام دے سکے۔ اس کو بھی حبل سے تعبیر کرتے ہیں۔ قرآن یا دین کو رسی سے اس لئے تعبیر کیا گیا کہ یہی وہ رشتہ ہے جو ایک طرف اہلِ ایمان کا تعلق اللہ تعالیٰ سے قائم کرتا ہے اور دوسری طرف تمام ایمان لانے والوں کو باہم ملا کر ایک جماعت بناتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ قرآن کریم کے اس ایک جملہ میں کئی حکیمانہ اصول بتائے گئے۔

ایک یہ کہ ہر انسان پر لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظامِ حیات یعنی قرآن کریم پر مضبوطی سے عامل ہو۔

دوسرے یہ کہ سب مسلمان مل کر اس پر عمل کریں، جس کا نتیجہ لازمی یہ ہے کہ مسلمان سب باہم متفق و متحد اور منظّم ہو جائیں، جیسے کوئی جماعت ایک رسی کو پکڑے ہوئے ہو تو پوری جماعت ایک جسم واحد بن جاتی ہے۔ قرآنِ کریم نے ایک دوسری آیت میں اس کو اور زیادہ واضح بیان فرمایا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَھُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ۝ ﴾

(سورۂ مریم: ۹۶)

ترجمہ: ”یعنی جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں اللہ تعالیٰ ان کی

آپس میں دوستی و محبت پیدا فرما دیتے ہیں۔“

پھر اس میں ایک لطیف تمثیل بھی ہے کہ مسلمان جب اللہ کی کتاب سے اعتصام کر رہے ہوں تو اس کی مثال اس حالت جیسی ہے جیسے کسی بلندی پر چڑھتے وقت ایک مضبوط رسی کو پکڑ لیں اور ہلاکت سے محفوظ رہیں۔ لہٰذا اشارہ فرمایا کہ اگر سب مل کر اس کو پوری قوت سے پکڑے رہو گے، تو کوئی شیطان شرانگیزی میں کامیاب نہ ہو سکے گا اور انفرادی زندگی کی طرح مسلم قوم کی اجتماعی قوت بھی غیر متزلزل اور ناقابلِ تسخیر ہو جائے گی۔ قرآنِ کریم سے تمسک کرنا ہی وہ چیز ہے جس سے بکھری ہوئی قوتیں جمع ہو جاتی ہیں اور ایک مردہ قوم حیاتِ جاوداں حاصل کر لیتی ہے اور اُس سے ہٹ کر ان کی قومی اور اجتماعی زندگی تو تباہ ہو گی ہی، لیکن انفرادی زندگی کی بھی کوئی خیر نہیں۔

پوری قوم کا اتفاق صرف اور صرف اسلام کی بنیاد پر ہو سکتا ہے۔ نسبی اور وطنی وحدت سے یہ کام کبھی نہیں ہو سکتا۔

قبائلِ عرب کی وحدت یہ تھی کہ قریش ایک قوم اور بنوتمیم دوسری قوم سمجھی جاتی تھی۔ کہیں رنگ کا امتیاز اس وحدت کا مرکز بن رہا تھا کہ کالے لوگ ایک قوم اور گورے دوسری قوم سمجھے جاتے تھے۔ کہیں وطنی اور لسانی وحدت کو مرکزِ اتحاد بنایا ہوا تھا کہ ہندی ایک قوم اور عربی دوسری قوم۔

قرآنِ کریم نے ان سب کو چھوڑ کر مرکزِ وحدت ”حَبْلُ اللّٰہِ“ یعنی اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظامِ محکم کو قرار دیا۔ اور دوٹوک فیصلہ کر دیا کہ مومن ایک قوم ہے جو ”حَبْلُ اللّٰہِ“ سے وابستہ ہے، اور کافر دوسری قوم جو اس حبلِ متین سے وابستہ نہیں۔ جغرافیائی و نسبی وحدتیں ہرگز اس قابل نہیں کہ ان کو مرکزِ وحدت قرار دیا جائے، کیونکہ وہ وحدتیں عموماً غیر اختیاری ہیں، جن کو کوئی انسان اپنے سعی وعمل سے حاصل نہیں کر سکتا۔ جو کالا ہے وہ گورا نہیں ہو سکتا۔ جو قریشی ہے وہ تمیمی نہیں بن سکتا۔ جو ہندی ہے وہ عربی نہیں بن سکتا۔ اس لئے ایسی وحدتیں بہت ہی محدود دائرہ میں ہو سکتی ہیں۔ ان کا دائرہ کبھی

اور کہیں پوری انسانیت کو اپنی وسعت میں لے کر پوری دُنیا کو ایک وحدت پر جمع کرنے کا دعویٰ کر ہی نہیں سکتا۔ اس لئے قرآنِ کریم نے مرکزِ وحدت ”حَبْلُ اللّٰہِ“ یعنی قرآن اور خدا تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظامِ حیات کو بنایا، جن کا اختیار کرنا اختیاری امر ہے۔ کوئی مشرق کا رہنے والا ہو یا مغرب کا، گورا ہو یا کالا، عربی زبان بولتا ہو یا ہندی وانگریزی، کسی قبیلہ یا کسی خاندان کا ہو، ہر شخص اس معقول اور صحیح مرکزِ وحدت کو اختیار کرسکتا ہے، اور دُنیا بھر کے پورے انسان اس مرکزِ وحدت پر جمع ہوکر بھائی بھائی بن سکتے ہیں۔

دوسرا یہ کہ اس وحدت کا ہر فرد اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظام کے مطابق اپنے اعمال واخلاق کی اصلاح کر کے اپنی دُنیوی اور دینی زندگی کو درست کر لے گا۔ یہ وہ حکیمانہ اصول ہے جس کو لے کر ایک مسلمان ساری دُنیا کی اقوام کو للکار سکتا ہے، کہ یہی صحیح راستہ ہے، اِس طرف آؤ، اور مسلمان اس پر جتنا بھی فخر کریں، بجا ہے، لیکن افسوس ہے کہ یورپ والوں کی گہری سازش جو اسلامی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے لئے صدیوں سے چل رہی ہے، وہ خود اسلام کے دعویداروں میں کامیاب ہوگئی۔ اب اُمتِ اسلامیہ کی وحدت عربی، مصری، ہندی، سندھی میں بٹ کر پارہ پارہ ہوگئی۔ ان سب کو بآوازِ بلند یہ دعوت دے رہی ہے کہ یہ جاہلانہ امتیاز درحقیقت امتیازات ہیں اور نہ ان کی بنیاد پر قائم ہونے والی وحدت کوئی معقول وحدت ہے، اس لئے ”اعتصام بِحَبْلِ اللّٰہ“ کی وحدت اختیار کریں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے تین چیزوں کو پسند فرمایا ہے اور تین چیزوں کو ناپسند۔ پسندیدہ چیزیں یہ ہیں:

اوّل: یہ کہ تم عبادت اللہ تعالیٰ کے لئے کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔

دوم: یہ کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کو مضبوطی سے تھامو، اور نااتفاقی سے بچو۔

سوم: یہ کہ اپنے حکام اور اولوالامر کے حق میں خیر خواہی کا جذبہ رکھو۔

اور وہ تین چیزیں جن سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں، یہ ہیں:

1. بے ضرورت قیل وقال اور بحث ومباحثہ۔
2. بلاضرورت کسی سے سوال کرنا۔
3. اضاعتِ مال۔ (ابن کثیر عن ابی ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

مسلمانوں کا باہمی اتحاد اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر موقوف ہے۔ اگر مسلمان مستحکم تنظیم و اتحاد چاہتا ہے تو اس کا ذریعہ فقط یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کو اپنا شعار بنالے۔ اِسی طرف اشارہ کرنے کے لئے اسی آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا:

﴿ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴾ (آل عمران:۱۰۳)

ترجمہ: ''اِسی طرح اللہ تعالیٰ تم لوگوں کے لئے حقائق واضح کر کے بیان فرماتے ہیں تاکہ تم لوگ صحیح راہ پر آجاؤ۔''

لہٰذا بقول استادمرحوم شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ ''اللہ کی یہ رسّی ٹوٹ تو نہیں سکتی، ہاں چھوٹ سکتی ہے۔'' اس لئے قرآنِ کریم نے اس رسی کے چھوٹ جانے کے خطرے کے پیش نظر یہ ہدایت جاری فرمائی کہ ہر مسلمان جس طرح خود نیک عمل کرنے کو اور گناہ سے بچنے کو اپنا فرض سمجھتا ہے، اِس کو بھی ضروری سمجھے کہ دوسرے لوگوں کو بھی نیک عمل کی ہدایت اور برے اعمال سے روکنے کی کوشش کرتا رہے، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سب مل کر مضبوطی کے ساتھ حبلِ متین کو تھامے رہیں گے اور اس کے نتیجہ میں فلاحِ دنیا وآخرت ان کے ساتھ ہوگی۔ (معارف القرآن)

قرآنِ کریم

دنیا کی سب سے بڑی نعمت قرآنِ کریم ہے۔ قرآنِ کریم اس جہان میں وہ نعمتِ بے بہا ہے کہ سارا جہان آسمان وزمین اوران میں پیدا ہونے والی مخلوقات اس کا بدل نہیں بن سکتیں۔

انسان کی سب سے بڑی سعادت اور خوش نصیبی یہ ہے کہ اپنی مقدور بھر قرآن کریم میں اشتغال اوراس کو حاصل کرتا رہے۔ اورسب سے بڑی شقاوت و بدنصیبی یہ ہے کہ اس سے اعراض اوراسے چھوڑے رکھے۔ اس لئے ہر مسلمان پر فرض عین اور ضروری ہے کہ قرآنِ کریم کو صحتِ لفظی کے ساتھ خود بھی پڑھے اور اولاد کو بھی پڑھانے کی کوشش کرے، اور پھر جس قدر ممکن ہو اس کے معانی اور احکام کو سمجھنے اوران پر عمل کرنے کی فکر میں لگا رہے، اوراس کو اپنی پوری عمر کا وظیفہ بنائے، اوراپنے حوصلے اور ہمت کے مطابق اس کو جو حصہ بھی نصیب ہو جائے، اس کو اس جہان کی سب سے بڑی نعمت سمجھے۔

تاریخ نزولِ قرآنِ کریم

قرآنِ کریم دراصل کلام الٰہی ہے، اس لئے ازل سے لوحِ محفوظ میں موجود ہے۔ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:

﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ﴾

ترجمہ: ”بلکہ یہ قرآن مجید ہے، لوح محفوظ میں۔“

قرآنِ کریم کا نزول دو مرتبہ ہوا ہے۔ ایک مرتبہ یہ پورے کا پورا لوحِ محفوظ سے بیت العزت جو کہ آسمانِ دنیا پر واقع ہے اس پر نازل کیا گیا۔

پھر دوسری مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تھوڑا تھوڑا کر کے حسب ضرورت نازل کیا جاتا رہا۔ یہاں تک کہ تیئس ۲۳ سال میں اس کی تکمیل ہوئی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نزولِ وحی کے طریقے

''وحی'' محض ایک دینی اعتقاد ہی نہیں بلکہ ایک عقلی ضرورت ہے جس کا انکار درحقیقت اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ کا انکار ہے۔

وحی و رسالت کا یہ مقدس سلسلہ سرکار دو عالم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوگیا۔ اب کسی انسان پر نہ وحی نازل ہوگی، نہ اس کی ضرورت ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر مختلف طریقوں سے وحی نازل ہوتی تھی۔

''صحیح بخاری کی ایک حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ: ایک مرتبہ حضرت حارث بن ہشام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ پر وحی کس طرح آتی ہے؟ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: کبھی تو مجھے گھنٹی کی سی آواز سنائی دیتی ہے اور وحی کی یہ صورت میرے لئے سب سے سخت ہوتی ہے، پھر جب یہ سلسلہ ختم ہوتا ہے تو جو کچھ اس آواز نے کہا ہوتا ہے، وہ مجھے یاد ہو چکا ہوتا ہے اور کبھی فرشتہ میرے سامنے ایک مرد کی صورت میں آجاتا ہے۔'' (صحیح بخاری جلد ۱ صفحہ ۲)

اس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''وحی'' کی آواز کو گھنٹیوں کی آواز سے جو تشبیہ دی ہے، شیخ محی الدین ابن عربی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ایک تو وحی کی آواز گھنٹی کی طرح مسلسل ہوتی ہے جو بیچ میں ٹوٹتی نہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ گھنٹی جب مسلسل بجتی ہے، تو عموماً سننے والے کو اس کی آواز کی سمت متعین کرنا مشکل ہوتا ہے، کیونکہ اس کی آواز ہر جہت سے آئی ہوئی محسوس ہوتی ہے، اور

کلامِ الٰہی کی بھی یہ خصوصیت ہے کہ اس کی کوئی ایک سمت نہیں ہوتی، بلکہ ہر جہت سے آواز سنائی دیتی ہے۔ اس کیفیت کا صحیح ادراک تو بغیر مشاہدہ کے ممکن نہیں، لیکن اس بات کو عام ذہنوں سے قریب کرنے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے گھنٹیوں کی آواز سے تشبیہ دے دی ہے۔ (فیض الباری جلد ا صفحہ ۱۹،۲۰)

جب اس طریقہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر بہت زیادہ بوجھ پڑتا تھا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اسی حدیث کے آخر میں فرماتی ہیں کہ میں نے سخت جاڑوں کے دن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتے ہوئے دیکھی ہے۔ ایسی سردی میں بھی جب وحی کا سلسلہ ختم ہوتا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک پیشانی پسینہ سے شرابور ہو چکی ہوتی تھی۔

ا ...... ایک اور روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ: جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سانس رکنے لگتا، چہرۂ انور متغیر ہو کر کھجور کی شاخ کی طرح زرد پڑ جاتا، سامنے کے دانت سردی سے کپکپانے لگتے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا پسینہ آتا کہ اس کے قطرے موتیوں کی طرح ڈھلکنے لگتے تھے۔ (الاتقان جلد ا صفحہ ۴۶)

وحی کی اس کیفیت میں بعض اوقات اتنی شدت پیدا ہو جاتی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جس جانور پر اس وقت سوار ہوتے، وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بوجھ سے دب کر بیٹھ جاتا۔ ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا سرِ اقدس حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زانو پر رکھا ہوا تھا کہ اسی حالت میں وحی نازل ہونی شروع ہو گئی۔ اس سے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ران پر اتنا بوجھ پڑا کہ وہ ٹوٹنے لگی۔

(زاد المعاد جلد ا صفحہ ۱۸، ۱۹)

بعض اوقات اس وحی کی ہلکی ہلکی آواز دوسروں کو بھی محسوس ہوتی تھی۔ حضرت عمر

رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور کے قریب شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسی آواز سنائی دیتی تھی۔ (تبویب مسند احمد کتاب السیرۃ النبویۃ صلی اللہ علیہ وسلم جلد ۲۰ صفحہ ۲۱۲)

❷ ..... وحی کی دوسری صورت یہ تھی کہ فرشتہ کسی انسانی شکل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر اللہ کا پیغام پہنچا دیتا تھا، ایسے مواقع پر عموماً حضرت جبرئیل علیہ السلام مشہور صحابی حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صورت میں تشریف لایا کرتے تھے۔ البتہ بعض اوقات کسی دوسری صورت میں بھی تشریف لائے ہیں۔ بہرکیف جب حضرت جبرئیل علیہ السلام انسانی شکل میں وحی لے کر آتے، تو نزولِ وحی کی یہ صورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے سب سے آسان ہوتی تھی۔ (الاتقان جلد ا صفحہ ۴۶)

❸ .....وحی کی تیسری صورت یہ تھی کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کسی انسان کی شکل اختیار کئے بغیر اپنی اصل صورت میں دکھائی دیتے تھے، لیکن ایسا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر میں صرف تین مرتبہ ہوا ہے۔ ایک مرتبہ اس وقت جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حضرت جبرئیل علیہ السلام کو ان کی اصل شکل میں دیکھنے کی خواہش ظاہر فرمائی تھی۔ دوسری مرتبہ معراج میں اور تیسری بار نبوت ملنے کے بالکل ابتدائی زمانے میں مکہ مکرمہ کے مقام اجیاد پر۔ پہلے دو واقعات تو صحیح سند سے ثابت ہیں، البتہ یہ آخری واقعہ سنداً کمزور ہونے کی وجہ سے مشکوک ہے۔ (فتح الباری جلد ا صفحہ ۱۸، ۱۹)

❹ .....چوتھی صورت براہ راست اور بلا واسطہ اللہ تبارک و تعالیٰ سے ہم کلامی کی ہے۔ یہ شرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بیداری کی حالت میں صرف ایک بار، یعنی معراج کے وقت حاصل ہوا ہے۔ البتہ ایک مرتبہ خواب میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے ہیں۔ (اتقان جلد ا صفحہ ۴۶)

❺ .....وحی کی پانچویں صورت یہ تھی کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کسی صورت میں سامنے آئے بغیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک میں کوئی بات القاء فرما دیتے

تھے۔اسے اصطلاح میں "نفث فی الرّوع" کہتے ہیں۔(ایضاً)

ہر مومن کا ایمان ہے کہ قرآنِ کریم قیامت تک آنے والی نسلوں کی ہدایت کے لئے نازل ہوا ہے اور قیامت تک پیدا ہونے والے تمام مسائل کا حل اس میں موجود ہے، بشرطیکہ قرآن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان وتشریح کی روشنی میں دیکھا اور پڑھا جائے اور اس میں پورے تدبر سے کام لیا جائے۔

اس لئے ہر مسلمان کو اس کی فکر فرضِ عین اور ضروری ہے۔(معارف القرآن)

﴿ وَلَا تَقْفُ مَالَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ﴾

(سورہ بنی اسرائیل آیت:۳۶)

ترجمہ: "اور نہ پیچھے پڑ جس بات کی خبر نہیں تجھ کو۔ بیشک کان، آنکھ اور دل، ان میں سے ہر ایک پرسش کیا جانے والا ہے۔(ہر ایک کی پرسش ہوگی)۔"

قرآنِ کریم کی فضیلت

ترجمۂ حدیث: ''حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو قرآن شریف کو سیکھے اور سکھائے۔''

(رواہ البخاری وابوداود والترمذی والنسائی وابن ماجہ)

کلامِ پاک چونکہ اصلِ دین ہے۔ اس کی بقا و اشاعت پر ہی دین کا مدار ہے۔ اس لئے اس کے سیکھنے اور سکھانے کا افضل ہونا ظاہر ہے، کسی توضیح کا محتاج نہیں، البتہ اس کی انواع مختلف ہیں۔ افضل درجہ اس کا یہ ہے کہ آدمی مطالب و مقاصد سمیت اس کو سیکھے اور ادنیٰ درجہ اس کا یہ ہے کہ فقط الفاظ سیکھے۔

ایک دوسری حدیث میں ملاّ علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے کہ: جس شخص نے کلامِ پاک کو حاصل کرلیا، اس نے علومِ نبوت کو اپنی پیشانی میں جمع کرلیا۔

سہل طستری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہٗ سے محبت کی علامت یہ ہے کہ اس کے کلام پاک کی محبت قلب میں ہو۔

شرح احیاء العلوم میں ان لوگوں کی فہرست میں جو قیامت کے ہولناک دن میں عرش کے سایہ کے نیچے رہیں گے، ان لوگوں کو بھی شمار کیا ہے، جو مسلمانوں کے بچوں کو قرآن پاک کی تعلیم دیتے تھے۔ نیز ان لوگوں کو بھی شمار کیا ہے جو بچپن میں قرآن شریف سیکھتے ہیں اور بڑے ہوکر اس کی تلاوت کا اہتمام کرتے ہیں۔

ترجمۂ حدیث: ''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ حق سبحانہٗ وتعالیٰ کا یہ فرمان ہے کہ جس شخص کو قرآن شریف کی مشغولی کی وجہ سے ذکر کرنے اور

دعائیں مانگنے کی فرصت نہیں ملتی، میں اس کو سب دعائیں مانگنے والوں سے زیادہ عطا کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ شانہٗ کے کلام کو سب کلاموں پر ایسی ہی فضیلت ہے، جیسی کہ خود حق تعالیٰ شانہٗ کو تمام مخلوق پر۔''

(رواہ الترمذی والدارمی والبیہقی)

یعنی جس شخص کو قرآن پاک یاد کرنے یا جاننے اور سمجھنے میں اس درجہ مشغولی ہے کہ کسی دوسری دُعا وغیرہ کے مانگنے کا اس کو وقت نہیں ملتا، میں دُعا مانگنے والوں کے مانگنے سے بھی افضل چیز اس کو عطا کروں گا۔

ترجمہ حدیث: ''حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ قرآن کا ماہر ان ملائکہ کے ساتھ ہے جو میر منشی ہیں اور نیک کار ہیں اور جو شخص قرآن شریف کو اٹکتا ہوا پڑھتا ہے اور اس میں دِقت اٹھاتا ہے اس کو دوہرا اجر ملتا ہے۔''

(رواہ البخاری ومسلم وابوداود والترمذی والنسائی وابن ماجہ)

قرآن شریف کا ماہر وہ کہلاتا ہے جس کو یاد بھی خوب ہو اور پڑھتا بھی خوب ہو اور اگر معانی ومراد پر قادر ہو تو پھر کیا کہنا۔

ملائکہ کے ساتھ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بھی قرآن شریف کے لوحِ محفوظ سے نقل کرنے والے ہیں اور یہ بھی اس کا نقل کرنے والا اور پہنچانے والا ہے، تو گویا دونوں ایک ہی مسلک پر ہیں یا یہ کہ حشر میں ان کے ساتھ اجتماع ہوگا۔ اٹکنے والے کو دوہرا اَجر ایک اس کی قرأت کا، دوسرا اس کی مشقت کا جو اس بار بار اٹکنے کی وجہ سے برداشت کرتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس ماہر سے بڑھ جائے۔ ماہر کے لئے جو فضیلت ارشاد فرمائی گئی ہے، وہ اس سے بہت بڑھ کر ہے (کہ مخصوص ملائکہ کے ساتھ اس کا اجتماع فرمایا ہے)، بلکہ مقصود یہ ہے کہ اس کے اٹکنے کی وجہ سے اس کو مشقت کا اَجر مستقل ملے گا۔ لہٰذا اِس عذر کی وجہ سے کسی کو قرآن کی تلاوت چھوڑنا

نہیں چاہئے۔

ملاّ علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے طبرانی اور بیہقی کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ جو شخص قرآن شریف پڑھتا ہے اور وہ یاد نہیں ہوتا، تو اس کے لئے دوہرا اجر ہے اور جو اس کو یاد کرنے کی تمنا کرتا ہے، لیکن یاد کرنے کی طاقت نہیں رکھتا، مگر وہ پڑھنا بھی نہیں چھوڑتا تو حق تعالیٰ شانہٗ اس کا حفاظ ہی کے ساتھ حشر فرمائیں گے۔

ترجمہ حدیث: ''حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ حسد دو شخصوں کے سوا کسی پر جائز نہیں۔ ایک وہ جس کو حق تعالیٰ شانہٗ نے قرآن شریف کی تلاوت عطا فرمائی اور وہ دن رات اس میں مشغول رہتا ہے، دوسرے وہ جس کو حق سبحانہٗ نے مال کی کثرت عطا فرمائی اور وہ دن رات اللہ کی راہ میں اس کو خرچ کرتا رہتا ہے۔'' (رواہ البخاری والترمذی والنسائی)

قرآن شریف کی آیات اور احادیث کثیرہ کے عموم سے حسد کی برائی اور ناجائز ہونا مطلقاً معلوم ہوتا ہے۔ اس حدیث شریف سے دو آدمیوں کے بارے میں جواز معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ وہ روایات زیادہ مشہور وکثیر ہیں، اس لئے علماء نے اس حدیث کے دو مطلب ارشاد فرمائے ہیں۔

اوّل: یہ کہ حسد اس حدیث شریف میں رشک کے معنی میں ہے جس کو عربی میں غبطہ کہتے ہیں۔ حسد اور غبطہ میں یہ فرق ہے کہ حسد میں کسی کے پاس کوئی نعمت دیکھ کر یہ آرزو ہوتی ہے کہ اس کے پاس یہ نعمت نہ رہے، خواہ اپنے پاس حاصل ہو یا نہ ہو، اور رشک میں اپنے پاس اس کے حصول کی تمنا و آرزو ہوتی ہے۔ عام ہے کہ دوسرے سے زائل ہو یا نہ ہو۔ چونکہ حسد بالا جماع حرام ہے، اس لئے علماء نے اس لفظ حسد کو مجازاً غبطہ کے معنی میں لیا ہے جو دُنیوی امور میں مباح ہے اور دینی امور میں مستحب۔

دوم: یہ کہ اگر حسد جائز ہوتا تو ان دو قسم کے آدمیوں پر کیا جاتا۔

ترجمہ حدیث: ’’حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ: حق تعالیٰ شانہٗ اس کتاب یعنی قرآن پاک کی وجہ سے کتنے ہی لوگوں کو بلند مرتبہ عطا کرتا ہے اور کتنے ہی لوگوں کو پست و ذلیل کرتا ہے۔‘‘ (رواہ مسلم)

یعنی جو لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں، عمل کرتے ہیں، حق تعالیٰ شانہٗ ان کو دُنیا و آخرت میں رفعت و عزت عطا فرماتے ہیں اور جو لوگ اس پر عمل نہیں کرتے، حق سبحانہٗ و تقدس اُن کو ذلیل کرتے ہیں۔ کلام اللہ شریف کی آیات سے بھی یہ مضمون ثابت ہوتا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّ يَهْدِىْ بِهٖ كَثِيْرًا﴾ (البقرہ:۲۶)

حق تعالیٰ شانہٗ اس کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو ہدایت فرماتے ہیں اور بہت سے لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔

بعض مشائخ سے احیاء العلوم میں نقل کیا ہے کہ بندہ ایک سورت کلام پاک کی شروع کرتا ہے، تو ملائکہ اس کے لئے رحمت کی دعا کرتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ وہ فارغ ہو۔ اور دوسرا شخص ایک سورت شروع کرتا ہے، تو ملائکہ اس کے ختم ہونے تک اس پر لعنت کرتے ہیں۔

عامر بن واثلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ: حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نافع بن عبدالحارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مکہ مکرّمہ کا حاکم بنا رکھا تھا۔ ان سے ایک دفعہ دریافت فرمایا کہ: جنگلات کا ناظم کس کو مقرر کر رکھا ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ ابن اَبزیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا کہ ابن اَبزیٰ کون شخص ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ ہمارا ایک غلام ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اعتراضاً فرمایا کہ غلام کو امیر کیوں بنا دیا؟ انہوں نے کہا کہ کتابُ اللہ کا پڑھنے والا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس حدیث کو نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ

وسلم کا ارشاد ہے کہ: حق تعالیٰ شانہٗ اس کلام کی بدولت بہت سے لوگوں کے رفع درجات فرماتے ہیں اور بہت سوں کو پست کرتے ہیں۔

ترجمہ حدیث: ’’حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ: تین چیزیں قیامت کے دن عرش کے نیچے ہوں گی۔ ایک کلام پاک جو بندوں سے جھگڑے گا، قرآن پاک کے لئے ظاہر ہے اور باطن، دوسری چیز امانت ہے۔ اور تیسری رشتہ داری جو پکارے گی کہ جس شخص نے مجھ کو جوڑا اللہ اپنی رحمت سے اس کو ملا دے اور جس نے مجھ کو توڑا اللہ اپنی رحمت سے اس کو جدا کردے۔‘‘ (رواہ فی شرح السنۃ)

ان چیزوں کے عرش کے نیچے ہونے سے مقصود ان کا کمالِ قرب ہے یعنی حق سبحانہٗ و تقدس کے عالی دربار میں بہت ہی قریب ہوں گی۔ کلامُ اللہ شریف کے جھگڑنے کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے اس کی رعایت کی، اس کا حق ادا کیا، اس پر عمل کیا، ان کی طرف سے دربارِ حق سبحانہٗ میں جھگڑے گا اور شفاعت کرے گا، اُن کے درجے بلند کرائے گا۔

ملّا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے بروایت ترمذی نقل کیا ہے کہ قرآن شریف بارگاہِ الٰہی میں عرض کرے گا کہ: اس کو جوڑا مرحمت فرمائیں تو حق تعالیٰ شانہٗ کرامت کا تاج مرحمت فرمادیں گے۔ پھر وہ زیادتی کی درخواست کرے گا، تو حق تعالیٰ شانہٗ اکرام کا پورا جوڑا مرحمت فرمادیں گے۔ پھر وہ درخواست کرے گا کہ یا اللہ! آپ اس شخص سے راضی ہوجائیں، تو حق سبحانہٗ وتقدس اس سے رضا کا اظہار فرمادیں گے اور جب کہ دُنیا میں محبوب کی رضا سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ہوتی، تو آخرت میں محبوب کی رضا کا مقابلہ کون سی نعمت کرسکتی ہے۔ اور جن لوگوں نے اس کی حق تلفی کی ہے، قرآن اُن سے اِس بارے میں مطالبہ کرے گا کہ میری کیا رعایت کی؟ میرا کیا حق ادا کیا؟ شرح

احیاء العلوم میں امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے کہ سال میں دو مرتبہ قرآن شریف ختم کرنا قرآن کا حق ہے۔ اب وہ حضرات جو کبھی بھول کر بھی تلاوت نہیں کرتے ذرا غور فرمالیں کہ اس قوی مقابل کے سامنے کیا جواب دہی کریں گے؟ موت بہرحال آنے والی چیز ہے، اس سے کسی طرح مفر نہیں۔

قرآن شریف کے ظاہر اور باطن ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کے ایک ظاہری معنی ہیں، جن کو ہر شخص سمجھتا ہے اور ایک باطنی معنی ہیں جن کو ہر شخص نہیں سمجھتا، جس کی طرف حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد نے اشارہ کیا ہے کہ جو شخص قرآن پاک میں اپنی رائے سے کچھ کہے اگر وہ صحیح بھی ہو تب بھی اس شخص نے خطا کی۔

اہلِ فن نے تفسیر کے لئے پندرہ علوم پر مہارت ضروری بتلائی ہے۔ بطنِ کلام پاک تک رسائی ہر شخص کو نہیں ہوسکتی۔

علامہ مجاہد رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ جو شخص اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اس کو جائز نہیں کہ بدون معرفت لغاتِ عرب کے کلام پاک میں کچھ لب کشائی کرے اور چند لغات کا معلوم ہوجانا کافی نہیں۔ اس لئے کہ بسا اوقات لفظ چند معانی میں مشترک ہوتا ہے اور وہ ان میں سے ایک دو معنی جانتا ہے اور فی الواقع اس جگہ کوئی اور معنی مراد ہوتے ہیں۔

ترجمہ حدیث: ”حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے کہ: (قیامت کے دن) صاحبِ قرآن سے کہا جائے گا کہ قرآن شریف پڑھتا جا اور بہشت کے درجوں پر چڑھتا جا۔ اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھ، جیسا کہ تو دُنیا میں ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرتا تھا۔ بس تیرا مرتبہ وہی ہے جہاں آخری آیت پر پہنچے۔“

(رواہ احمد والترمذی وابوداود والنسائی وابن ماجہ وابن حبان فی صحیحہ)

شراح اور مشائخ کے نزدیک حدیث بالا کا مطلب یہ ہے کہ قرآن پاک کی ایک ایک آیت پڑھتا جا اور ایک ایک درجہ اوپر چڑھتا جا۔ اس لئے کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت کے درجات کلامُ اللہ شریف کی آیات کے برابر ہیں، لہٰذا جو شخص جتنی آیات کا ماہر ہوگا، اتنے ہی درجے پر اس کا ٹھکانہ ہوگا اور جو شخص تمام کلام پاک کا ماہر ہوگا، وہ سب سے اوپر کے درجے میں ہوگا۔

ملاّ علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک حدیث سے نقل کیا ہے کہ اگر دُنیا میں بکثرت تلاوت کرتا رہا تب تو اس وقت بھی یاد ہوگا، ورنہ بھول جائے گا۔

بعض احادیث میں وارد ہوا ہے کہ جو شخص قرآن پاک یاد کرتا ہوا اور اس میں محنت و مشقت برداشت کرتا ہوا مر جائے وہ حفاظ کی جماعت میں شمار ہوگا۔ حق تعالیٰ کے یہاں عطا میں کوئی کمی نہیں، کوئی لینے والا ہو۔

ترجمہ حدیث: ''حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے کہ: جس شخص نے قرآن پڑھا، پھر اس کو حفظ کیا (یاد کیا) اور اس کے حلال کو حلال جانا اور حرام کو حرام جانا، حق تعالیٰ شانہٗ اس کو جنت میں داخل فرماویں گے اور اس کے گھرانے میں سے ایسے دس آدمیوں کے بارے میں اس کی شفاعت قبول فرماویں گے، جن کے لئے جہنم واجب ہو چکی ہوگی۔'' (رواہ احمد والترمذی)

دخول جنت ویسے تو ہر مومن کے لئے ان شاء اللہ ہے ہی، اگرچہ بداعمالیوں کی سزا بھگت کر ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن حفاظ کے لئے یہ فضیلت ابتدائی دُخول کے اعتبار سے ہے۔ وہ دس شخص جن کے بارے میں شفاعت قبول کی جائے گی وہ فُسّاق و فجار ہیں، جو مرتکب کبائر رہے۔ اس لئے کہ کفار کے بارے میں تو شفاعت ہے ہی نہیں۔ مشرکین پر اللہ نے جنت کو حرام کر دیا اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور ظالمین کا کوئی مددگار نہیں۔ (القرآن)

اس لئے حفاظ کی شفاعت سے ان مسلمانوں کی شفاعت مراد ہے، جن کے معاصی کی وجہ سے ان کا جہنم میں داخل ہونا ضروری ہوگیا تھا۔

قرآن پاک کے ان سب فضائل اور خوبیوں کے ذکر کرنے سے مقصود اس کے ساتھ محبت پیدا کرنا ہے۔ اس لئے کلامُ اللہ شریف کی محبت حق تعالیٰ شانہٗ کی محبت کے لئے لازم وملزوم ہے اور ایک کی محبت دوسرے کی محبت کا سبب ہوتی ہے۔

حق سبحانہٗ وتقدس ہماری سیئات سے درگزر فرما کر ہمیں بھی اپنے نیک بندوں میں محض اپنے لطف وفضل سے شامل فرمائیں۔

وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ۝

(ماخوذ فضائل اعمال (فضائل قرآن) محمد زکریا کاندھلوی عفی عنہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾ (آل عمران:۳۱)

ترجمہ: ”تو کہہ اگر تم محبت رکھتے ہو اللہ کی تو میری راہ چلو تا کہ محبت کرے تم سے اللہ اور بخشے گناہ تمہارے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔“

اندھیروں سے نکالنے اور روشنی میں لانے کا واحد ذریعہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

﴿ الٓرٰ قف کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰـہُ اِلَیْکَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ۵ لا بِاِذْنِ رَبِّھِمْ اِلٰی صِرَاطِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ ۝ اللّٰہِ الَّذِیْ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ط وَوَیْلٌ لِّلْکٰفِرِیْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِیْدِ ن ۝ الَّذِیْنَ یَسْتَحِبُّوْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا عَلَی الْاٰخِرَۃِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَیَبْغُوْنَھَا عِوَجًا ط اُوْلٰئِکَ فِیْ ضَلٰلٍ م بَعِیْدٍ ۝ ﴾

(سورہ ابراہیم آیت:۱ تا ۳)

ترجمہ: ”یہ ایک کتاب ہے کہ ہم نے اُتاری تیری طرف کہ تو نکالے لوگوں کو اندھیروں سے اُجالے کی طرف، اُن کے رب کے حکم سے رستہ پر، اس زبردست خوبیوں والے اللہ کے، جس کا ہے جو کچھ کہ موجود ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں، اور مصیبت ہے کافروں کو ایک سخت عذاب سے جو کہ پسند رکھتے ہیں زندگی دُنیا کی آخرت پر اور روکتے ہیں اللہ کی راہ سے اور تلاش کرتے ہیں اس میں کجی، وہ راستہ بھول کر جا پڑے ہیں دور۔“

﴿ الٓرٰ قف کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰـہُ اِلَیْکَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ۵ لا بِاِذْنِ رَبِّھِمْ ﴾ (سورۂ ابراہیم:۱)

الٓرٰ، اُن حروف مقطعات میں سے ہے، جن کے متعلق بار بار ذکر کیا جا چکا ہے کہ اس میں اسلم اور بے غبار طریقہ سلف صالحین کا ہے کہ اس پر ایمان و یقین رکھیں کہ جو کچھ اس کی مراد ہے وہ حق ہے، لیکن اس کے معانی کی تحقیق و تفتیش کے درپے نہ ہوں۔ "کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْكَ" میں نحوی ترکیب کے لحاظ سے زیادہ واضح اور صاف بات یہ ہے کہ اس لفظ کو "هٰذَا" محذوف کی خبر بنا دی جائے۔ اور جملہ کے معنی یہ ہوں کہ یہ وہ کتاب ہے کہ جس کو ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نازل کیا ہے، اس میں نازل کرنے کی نسبت حق تعالیٰ شانہٗ کی طرف اور خطاب کی نسبتِ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرنے میں دو چیزوں کی طرف اشارہ کیا گیا۔

❶ ...... ایک یہ کہ یہ کتاب نہایت عظیم المرتبہ ہے کہ اس کو خود ذاتِ حق تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے۔

❷ ...... دوسرے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عالی مرتبہ ہونے کی طرف اشارہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا پہلا مخاطب بنایا ہے۔

﴿لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ﴾

لفظ "نَاسْ" عام انسانوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ اس سے مراد تمام عالم کے موجودہ اور آئندہ آنے والے انسان ہیں۔ "ظُلُمٰت" ظلمة کی جمع ہے جس کے معنی معروف و مشہور اندھیرے کے ہیں۔ یہاں "ظُلُمٰت" سے مراد کفر و شرک اور بداعمالیوں کی ظلمت ہے اور نور سے مراد ایمان کی روشنی ہے۔ اسی لئے لفظ "ظُلُمٰت" کو بصیغۂ جمع لایا گیا، کیونکہ کفر و شرک کی بہت سی انواع و اقسام ہیں۔ اسی طرح برے اعمال بھی بے شمار ہیں، اور لفظ "نُوْر" کو بصیغۂ مفرد لایا گیا، کیونکہ ایمان اور حق ایک ہی ہے۔

معنی آیت کے یہ ہیں کہ یہ کتاب ہم نے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نازل کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ذریعہ تمام عالم کے انسانوں کو کفر و

شرک اور برے کاموں کے اندھیروں سے نجات دلا کر ایمان اور حق کی روشنی میں لے آئیں، اُن کے رب کی اجازت سے۔

یہاں لفظ ربّ لانے میں اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عام انسانوں پر یہ انعام کہ اپنی کتاب اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اُن کو اندھیروں سے نجات دلائیں، اس کا سبب اور منشاء بجز اس لطف و مہربانی کے اور کچھ نہیں، جو تمام انسانوں کے خالق و مالک نے اپنی شانِ ربوبیت سے ان پر مبذول کر رکھی ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ کے ذمّہ نہ کسی کا کوئی حق لازم ہے، نہ کسی کا زور اس پر چلتا ہے۔

ہدایت صرف اللہ تعالیٰ کا فعل ہے

اس آیت میں اندھیرے سے نجات دے کر روشنی میں لانے کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ ہدایت دینا حقیقت میں حق تعالیٰ ہی کا فعل ہے، جیسا کہ ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے:

﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ﴾

(القصص:۵۶)

ترجمہ: ''یعنی آپ بہ اختیار خود کسی کو ہدایت نہیں دے سکتے، بلکہ اللہ تعالیٰ ہی جس کو چاہتا ہے، ہدایت دیتا ہے۔''

اسی لئے اس آیت میں ''بِاِذْنِ رَبِّهِمْ'' کا لفظ بڑھا کر یہ شبہ ختم کر دیا گیا۔ کیونکہ معنی آیت کے یہ ہو گئے کہ کفر و شرک کے اندھیروں سے نکال کر ایمان و عملِ صالح کی روشنی میں لانا، اگرچہ اصل حقیقت کی رو سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں نہیں، مگر اللہ تعالیٰ کے حکم و اجازت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کر سکتے ہیں۔

احکام و ہدایات

اس آیت سے معلوم ہوا کہ تمام بنی آدم اور نوعِ انسانی کو برائیوں کے اندھیروں

سے نکالنے اور روشنی میں لانے اور انسان و انسانیت کو دنیا و آخرت کی بربادی اور ہلاکت سے نجات دلانے کا واحد راستہ قرآنِ کریم ہے۔ جتنا جتنا لوگ اِس کے قریب آئیں گے، اسی انداز سے ان کو دُنیا میں بھی امن و امان، عافیت و اطمینان نصیب ہوگا اور آخرت میں بھی فلاح و کامیابی حاصل ہوگی، اور جتنا اس سے دور ہوں گے، اتنا ہی دونوں جہان کی خرابیوں، بربادیوں، مصیبتوں اور پریشانیوں کے غار میں گریں گے۔

آیت کے الفاظ میں یہ نہیں ظاہر کیا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کریم کے ذریعہ کس طرح لوگوں کو اندھیروں سے نجات دے کر روشنی میں لائیں گے، لیکن اتنی بات ظاہر ہے کہ کسی کتاب کے ذریعہ کسی قوم کو درست کرنے کا طریقہ یہی ہوتا ہے کہ اس کتاب کی تعلیمات و ہدایات کو اس قوم میں پھیلایا جائے اور ان کو اس کا پابند کیا جائے۔

قرآنِ کریم کی تلاوت بھی مستقل مقصد ہے

قرآنِ کریم کی ایک مزید خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کی تلاوت اور بغیر سمجھے ہوئے اس کے الفاظ کا پڑھنا بھی بالخاصہ انسان کے نفس پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس کو برائیوں سے بچنے میں مدد دیتا ہے۔ کفر و شرک کے کیسے ہی خوبصورت جال کیوں نہ ہوں، قرآن کریم پڑھنے والا اگرچہ بے سمجھے ہی پڑھتا ہو، ان کے دام میں نہیں آسکتا۔ ہندوؤں کی تحریکِ شدھی سنگھٹن کے زمانے میں اس کا مشاہدہ ہو چکا ہے کہ ان کے دام میں صرف وہ لوگ آئے، جو قرآن کریم کی تلاوت سے بھی بیگانہ تھے۔ آج عیسائی مشنریاں مسلمانوں کے ہر خطہ میں طرح طرح کے سبز باغ اور سنہرے جال لئے پھر رہی ہیں، لیکن ان کا اگر کوئی اثر پڑتا ہے، تو صرف ان گھرانوں پر جو قرآن کی تلاوت سے بھی غافل ہیں، خواہ جاہل ہونے کی وجہ سے یا نئی تعلیم کے غلط اثر سے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم ایک ایسا ہدایت نامہ ہے جس کے معانی سمجھ کر اس پر عمل کرنا تو اصل مقصد ہے ہی، لیکن اس کا انسانی زندگی کی اصلاح میں موثر ہونا بھی واضح ہے۔ اس کے ساتھ اس کے الفاظ کی تلاوت کرنا بھی غیر شعوری طور پر انسان کے نفس کی اصلاح میں نمایاں اثر رکھتا ہے۔

اس آیت میں بِاذنِ خداوندی اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لانے کی نسبت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کر کے یہ بھی بتلا دیا گیا ہے کہ اگرچہ ہدایت کا پیغام دینا حقیقتاً حق تعالیٰ کا فعل ہے، مگر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ کے بغیر اس کو حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ قرآنِ کریم کا مفہوم اور تعبیر بھی وہی معتبر ہے جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول یا عمل سے بتلا دیا ہے۔ اس کے خلاف کوئی تعبیر معتبر نہیں۔

﴿اِلٰی صِرَاطِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ اللّٰہِ الَّذِیْ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ط﴾

اس آیت کے شروع میں جو ظلمت و نور کا ذکر آیا ہے، ظاہر ہے کہ یہ وہ اندھیرا اور روشنی نہیں، جو عام آنکھوں سے نظر آئے، اس لئے اس کو واضح کرنے کے لئے اس جملے میں ارشاد فرمایا کہ وہ روشنی اللہ کا راستہ ہے، جس پر گامزن ہونے والا نہ اندھیرے میں چلنے والے کی طرح بھٹکتا ہے، نہ اس کو لغزش ہوتی ہے اور نہ وہ مقصد تک پہنچنے میں ناکام ہوتا ہے۔ اللہ کے راستہ سے مراد وہ راستہ ہے، جس پر چل کر انسان خدا تک پہنچ سکے اور اس کی رضا کا درجہ حاصل کر سکے۔

اس جگہ لفظ ''اللہ'' تو بعد میں لایا گیا، اس سے پہلے اس کی دو صفتیں عزیز اور حمید ذکر کی گئی ہیں۔ ''عزیز'' کے معنی عربی لغت کے اعتبار سے قوی اور غالب کے ہیں، اور ''حمید'' کے معنی وہ ذات جو حمد کی مستحق ہو، ان دو صفتوں کو اصل نامِ حق سے پہلے لانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ راستہ جس ذاتِ قدوس کی طرف لے جانے والا

ہے وہ ذات قوی و غالب بھی ہے اور حمد کی مستحق بھی، اس لئے اس پر چلنے والا نہ کہیں ٹھوکر کھائے گا، اور نہ ہی اس کی کوشش رائیگاں ہوگی، بلکہ اس کا منزلِ مقصود پر پہنچنا یقینی ہے، شرط یہ ہے کہ اس راستہ کو نہ چھوڑے۔

اللہ تعالیٰ کی یہ دو صفتیں پہلے بیان کرنے کے بعد فرمایا "اَللّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ" یعنی یہ وہ ذات کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب اُسی کا پیدا کیا ہوا اور اسی کی ملکِ خاص ہے، جس میں کوئی شریک نہیں۔

﴿ وَوَیْلٌ لِّلْكٰفِرِیْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِیْدِ ﴾

لفظ "وَیْلٌ" ہلاکت کے معنی میں آتا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ جو لوگ اس نعمتِ قرآن سے منکر ہیں اور کفر و شرک کے اندھیرے ہی میں رہنے کو پسند کرتے ہیں، ان کے لئے بڑی بربادی اور ہلاکت ہے اس عذابِ شدید سے جو ان پر آنے والا ہے۔

خلاصۂ مفہوم

آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم اس لئے نازل کیا گیا ہے کہ سب انسانوں کو اندھیرے سے نکال کر اللہ کے راستے کی روشنی میں لایا جائے، مگر جو بدنصیب قرآن کریم ہی کے منکر ہو جائیں تو وہ اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو عذاب میں ڈال رہے ہیں۔ جو لوگ قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کے منکر ہیں، وہ تو اس وعید کی مراد ہیں ہی، مگر جو اعتقاداً منکر نہیں، مگر عملاً قرآن کو چھوڑے ہوئے ہیں، نہ تلاوت سے ان کو کوئی واسطہ ہے اور نہ ہی اس کے سمجھنے اور عمل کرنے کی طرف کوئی التفات ہے، وہ بدنصیب بھی مسلمان ہونے کے باوجود اس وعید سے بالکل بَری نہیں۔

﴿ اَلَّذِیْنَ یَسْتَحِبُّوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا عَلَی الْاٰخِرَةِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَیَبْغُوْنَهَا عِوَجًا اُولٰٓئِكَ فِیْ ضَلٰلٍۢ بَعِیْدٍ ﴾

اس آیت میں منکرینِ قرآن کے تین حال بتلائے گئے ہیں۔

❶ ......ایک یہ کہ وہ دُنیا کی زندگی کو بہ نسبت آخرت کے زیادہ پسند کرتے ہیں اور ترجیح دیتے ہیں۔ اسی لئے دُنیا کے نفع یا آرام کی خاطر آخرت کا نقصان گوارا کر لیتے ہیں، اس میں ان کے مرض کی تشخیص کی طرف اشارہ ہے کہ یہ لوگ قرآنِ کریم کے واضح معجزات دیکھنے کے باوجود اس سے منکر کیوں ہیں؟

وجہ یہ ہے کہ ان کو دنیا کی موجودہ زندگی کی محبت نے آخرت کے معاملات سے اندھا کر رکھا ہے، اس لئے ان کو اپنا اندھیرا ہی پسند ہے۔ روشنی کی طرف آنے سے کوئی رغبت نہیں۔

❷ ...... دوسری خصلت ان کی یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ خود تو اندھیروں میں رہنے کو پسند کرتے ہی ہیں اس پر ظلم یہ ہے کہ وہ اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے کے لئے دوسروں کو بھی روشنی کی شاہراہ یعنی اللہ کے راستے سے روکتے ہیں۔

❸ ...... تیسری خصلت "یَبْغُوْنَھَا عِوَجًا" میں بیان کی گئی ہے، اس کے دو معنی ہوسکتے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ لوگ اپنی بد باطنی اور بد عملی کے سبب اس فکر میں لگے رہتے ہیں کہ اللہ کے روشن اور سیدھے راستہ میں کوئی کجی اور خرابی نظر آئے تو ان کو اعتراض اور طعن کا موقع ملے۔ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہی معنی بیان فرمائے ہیں۔

اور اس جملے کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ یہ لوگ اس فکر میں لگے رہتے ہیں کہ قرآن وسنت سے کوئی چیز ان کے خیالات اور خواہشات کے موافق مل جائے تو اس کو اپنی حقانیت کے استدلال میں پیش کریں، تفسیر قرطبی میں اسی معنی کو اختیار کیا گیا ہے۔ جیسے آج کل بے شمار نام نہاد اہلِ علم اس میں مبتلا ہیں کہ اپنے دل میں ایک خیال، کبھی اپنی غلطی سے، کبھی کسی دوسری قوم سے متاثر ہو کر گھڑ لیتے ہیں۔ پھر قرآن وحدیث میں اس کے مؤیدات تلاش کرتے ہیں اور کہیں کوئی لفظ اس خیال کی موافقت میں نظر آگیا، تو اس کو اپنے حق میں قرآنی دلیل سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ طریقہ کار اصولاً ہی غلط ہے، کیونکہ مومن کا کام یہ ہے کہ اپنے خیالات وخواہشات سے خالی الذہن ہو کر

کتاب وسنت کو دیکھے، جو کچھ ان سے واضح طور پر ثابت ہو جائے اسی کو اپنا مسلک قرار دے دے۔

"اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ" اس جملہ میں ان کفار کا انجامِ بد بیان کیا گیا ہے جن کی تین صفتیں اوپر بیان ہوئی ہیں، اور حاصل اس کا یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی گمراہی میں بڑی دور جا پہنچے ہیں، کہ اب ان کا راہ پر آنا مشکل ہے۔

(معارف القرآن جلد ۵)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ۝ وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ﴾ (الزخرف:۳۶،۳۷)

ترجمہ: "اور جو کوئی آنکھیں چرائے رحمٰن کی یاد سے، ہم اس پر مقرر کر دیں ایک شیطان، پھر وہ رہے اس کا ساتھی، اور وہ ان کو روکتے رہتے ہیں راہ سے اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم راہ پر ہیں۔"

نُزولِ سکینہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿هُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ لِیَزْدَادُوْٓا اِیْمَانًا مَّعَ اِیْمَانِهِمْ ط﴾ (پارہ:۲۶الفتح آیت:۴)

تَرجَمہ: ''وہی ہے جس نے اتارا اطمنان دل میں ایمان والوں کے، تا کہ اور بڑھ جائے ان کا ایمان اپنے ایمان کے ساتھ۔''

سکینہ وہ نور ہے، جو مؤمنین کاملین کے قلوب پر نازل ہوتا ہے اور یہ نعمت کائنات میں سوائے مومنین کاملین یعنی اولیاء اللہ کے کسی کو دستیاب نہیں، کیونکہ یہ ''مُنَزَّلٌ مِنَ السَّمَاءِ'' ہے ''مُخْرَجٌ مِنَ الْاَرْضِ'' نہیں، ورنہ ہر غیر متقی بھی اس کو حاصل کر لیتا۔ یعنی یہ نعمت آسمان سے عطا ہوتی ہے، زمین والوں کی دست رسی وہاں تک نہیں ہے۔

ناز ونخرے اور تکبّر کی راہ سے یہ نعمت عطا نہیں ہوتی، یہ تو گڑگڑانے سے ملتی ہے۔ اللہ سبحانہٗ تعالیٰ نے اس نعمت کو ایمان والوں کے لئے خاص رکھا ہے اور اس نعمت کے بعد ایمان والوں کا درجہ بڑھ جاتا ہے۔

سکینہ کی تین تفسیریں

علامہ آلوسی رحمہ اللہ تعالیٰ اپنی تفسیر روح المعانی میں (پارہ: ۱۱، ص: ۲۵) پر سکینہ کی تین تفسیریں فرماتے ہیں:

پہلی تفسیر:

﴿بِنُوْرٍ یَسْتَقِرُّ فِی الْقَلْبِ﴾

ترجمہ: ”سکینہ ایک نور ہے، جو مومن کے قلب میں ٹھہر جاتا ہے۔“

ٹھہرنے کا مطلب یہ ہے کہ مؤمن روئے زمین پر کہیں بھی ہو، وہ نور ان کے ساتھ رہتا ہے، جس کی علامت یہ ہے کہ صاحبِ نور کسی حالت میں اللہ سے غافل نہیں ہوتا۔ اسی کا نام سکینہ ہے اور یہ نور کیسے ملتا ہے؟

نورِ سکینہ کے حصول اور حفاظت کا طریقہ

نورِ سکینہ کے حصول اور حفاظت کا طریقہ اللہ کے ذکر اور تقویٰ سے ملتا ہے۔ بشرطیکہ اس نور کو ضائع نہ کیا جائے، ورنہ وہی مثال ہوگی جیسے ٹنکی تو پانی سے بھر دی، لیکن ٹونٹی کھلی چھوڑ دی، جس سے سارا پانی نکل گیا۔ اسی طرح ذکر سے تو قلب بھر گیا، لیکن گناہ بھی کر لئے، جس سے سارا نور ضائع ہوگیا۔ لٰہذا ذکر کے ساتھ تقویٰ کا اہتمام بھی ضروری ہے۔

دوسری تفسیر:

﴿وَبِهٖ يَثْبُتُ عَلَى التَّوَجُّهِ اِلَى الْحَقِّ﴾

ترجمہ: ”حق تعالیٰ کی طرف اُس کی توجہ ہر وقت رہتی ہے۔ ایک لمحہ بھی اپنے اللہ سے غافل نہیں ہوتا۔“

اس نور کی خاصیت یہ ہے کہ جس دل پر اللہ تعالیٰ سکینہ اتارتا ہے، ہر لمحۂ حیات، ہر سانس وہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہتا ہے، ایک لمحۂ کو بھی اگر غافل ہونا چاہے تو نہیں ہوسکتا۔

یہی وہ مقام ہے جس کو نسبت کہا جاتا ہے، جب نسبت قائم ہوگئی تو اب اللہ کو بھول نہیں سکتا۔ اب بھاگنا بھی چاہے تو بھاگ نہیں سکتا۔ بھلانا بھی چاہے تو بھلا نہیں سکتا۔ ایک لمحہ بھی اللہ کے بغیر نہیں جی سکتا۔

تیسری تفسیر:

﴿يَتَخَلَّصُ عَنِ الطَّيْشِ﴾

ترجمہ: ''یعنی ایسے شخص کو بے سکونی اور پریشانی سے نجات مل جاتی ہے۔''

دل ایک دم ٹھنڈا رہتا ہے جب کوئی پریشانی آئی دو رکعتیں پڑھیں، اللہ میاں سے رو کر دعا کر لی دل مطمئن ہوگیا۔ تخلص کے کیا معنی ہیں؟ یعنی خلاصی پا جاتے ہیں بے سکونی سے۔

یہ تو سکینہ کی تفسیر تھی۔ اب ''لِیَزْدَادُوْٓا اِیْمَانًا مَّعَ اِیْمَانِهِمْ'' کی تفسیر پیش خدمت ہے۔

نُزولِ سکینہ ازدیادِ ایمان یعنی نسبتِ خاصہ کا ذریعہ ہے

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مومنین کے دل پر سکینہ اس لئے نازل ہوتی ہے ''لِیَزْدَادُوْٓا اِیْمَانًا مَّعَ اِیْمَانِهِمْ'' (تاکہ اُن کے سابق ایمان کے ساتھ اُن کا ایمان اور زیادہ ہوجائے) کیونکہ ایمان تو پہلے بھی تھا، لیکن معلوم ہوا کہ سکینہ کا نور دل میں آنے کے بعد اُن کے موجودہ ایمان پر مستزاد ایمان ہوجاتا ہے۔ اس کی تفسیر حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سکینہ کا نور عطا ہونے سے پہلے اُن کا جو سابق ایمان تھا، اُس کا نام تھا ایمانِ عقلی، استدلالی، موروثی۔ یعنی ایمان عقل کی بنیاد پر تھا کہ عقل سے اللہ کو پہچانتا تھا اور استدلالی تھا کہ دلیلوں سے اللہ کو مانتا تھا اور دلائل سے اللہ کے وجود پر استدلال کرتا تھا۔ اور موروثی تھا کہ ماں باپ مسلمان تھے، لہٰذا ہم بھی مسلمان ہیں۔

لیکن جب سکینہ کا نور عطا ہوتا ہے، تو یہ ایمانِ عقلی، استدلالی اور موروثی، ایمانِ ذوقی، حالی، وجدانی میں تبدیل ہوجاتا ہے۔

ایمانِ ذوقی کیا ہے؟ یعنی دل میں مزہ چکھ لیتا ہے، کہ میرا اللہ کیسا ہے، دل اللہ کے قرب کی لذت کو چکھ لیتا ہے۔ ذوق کے معنی چکھنے کے ہیں۔

اور ایمانِ حالی یہ ہے کہ: ایمان دل میں اُتر جاتا ہے۔ "حالٌ" معنی اترنے کے ہیں۔ اللہ کو پہچاننے کے لئے اب اُس کو کسی استدلال کی ضرورت نہیں رہتی، بلکہ ایمان دل میں حال ہوجاتا ہے، دل میں وہ اللہ کو محسوس کرنے لگتا ہے اور ایمانِ وجدانی نصیب ہوتا ہے۔

وجدان کا معنی پانا یعنی دل میں اللہ کو پاتا ہے۔ پھر عالمِ غیب اس کے لئے برائے نام عالمِ غیب رہتا ہے، وہ دل کی آنکھوں سے گویا ہر وقت اللہ تعالیٰ کو دیکھتا ہے۔ اِس ایمانی کیفیت کی شرح علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح بخاری میں یہ فرمائی ہے۔

﴿اَنْ یَّغْلِبَ عَلَیْہِ مُشَاھَدَۃُ الْحَقِّ بِقَلْبِہٖ حَتّٰی کَاَنَّہٗ یَرَاہُ تَعَالٰی شَانُہٗ بِعَیْنِہٖ﴾ (فتح الباری جلد ا صفحہ ۱۲۰)

تَرْجَمَہ: "یعنی قلب پر مشاہدۂ حق ایسا غالب ہوجائے کہ گویا آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے۔"

دل میں جب اللہ کو پاتا ہے، اللہ کے قرب کی لذّت کو چکھتا ہے، دل میں اللہ تعالیٰ کو محسوس کرنے لگتا ہے، تو غلبۂ قربِ حق سے یہ آسمان بھی اس کے لئے حجاب نہیں رہتے۔

ایمانِ عقلی، استدلالی، موروثی و ایمانِ ذوقی، حالی، و وجدانی کی تمثیل

قلب میں اس ایمانی کیفیت کی مثال ایسی ہے کہ جیسے ایک دریا ہے، جس میں پانی نہیں ہے، خشک ہے، خاک اُڑا رہا ہے۔ اُس وقت دریا پانی پر کیسے ایمان لائے

گا؟ عقل کے استدلال سے، یا دوسرے دریاؤں سے سن کر کہ پانی ایسا ہوتا ہے۔ لیکن جب اُس کے اندر پانی آجائے گا، اُس وقت اُس کا ایمان کیسا ہوگا؟ ذوقی، حالی، وجدانی، پھر وہ دلیل نہیں مانگے گا کہ ہم کو پانی کی دلیل چاہئے۔ وہ تو کہے گا کہ میرے سینہ کے اندر تو خود پانی لبالب بہہ رہا ہے، دور دور میری ٹھنڈک جارہی ہے، میں اپنے اندر پانی کو محسوس کر رہا ہوں، مجھے دلیل کی کیا ضرورت ہے؟ جس دریا میں پانی ہوتا ہے، دور دور تک اس کی ٹھنڈک جاتی ہے۔ ہواؤں کی ٹھنڈک بتا دیتی ہے کہ دریا قریب ہے۔

اسی طرح قلب میں پہلے ایمانِ عقلی و استدلالی ہوتا ہے۔ عقل کے استدلال سے دوسروں سے سن کر وہ اللہ پر ایمان لاتا ہے، لیکن سکینہ کا نور عطا ہونے کے بعد اب وہ ایمان ایمانِ ذوقی، حالی، وجدانی میں تبدیل ہوجاتا ہے کہ دل میں وہ اللہ تعالیٰ کا قرب محسوس کرتا ہے۔ اس احسانی کیفیت کو صوفیاء نسبت سے تعبیر کرتے ہیں۔ جب کوئی صاحبِ نسبت (اللہ والا) کسی بستی میں رہتا ہے، تو اس کی ٹھنڈک دور دور تک جاتی ہے، دور دور تک اس کا فیض جاتا ہے۔ ہزاروں بندے اس کے فیضِ صحبت سے اللہ والے بن جاتے ہیں۔ اس آیت ''لِيَزْدَادُوْا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ'' میں صوفیاء کی اصطلاح نسبت خاصہ کا ثبوت ہے۔

ذکرُ اللہ سے نُزولِ سکینہ کی دلیلِ نقلی اور ایک علمِ عظیم

اب یہ ایمان ذوقی، حالی، وجدانی یعنی نسبتِ خاصہ کیسے حاصل ہوتی ہے۔ یہ ایک علمِ عظیم ہے۔ مسلم شریف کی روایت ہے۔

﴿لَا يَقْعُدُ قَوْمٌ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا حَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ﴾

جب کوئی قوم اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہوتی ہے، تو فرشتے اُس کو گھیر لیتے ہیں۔ اس کا عاشقانہ ترجمہ ہے کہ ذاکرین کی فرشتوں سے ملاقات ہوتی ہے۔ اس

طرح خاکی مخلوق کو نوری مخلوق کی مصاحبت نصیب ہوجاتی ہے اور اِس صحبت کی برکت سے فرشتوں کے پاکیزہ اخلاق اور اُن کے ذوقِ عبادت کی اِن خاکی بندوں کے قلوب میں منتقل ہونے کی توقع ہوتی ہے۔

ذکر کا دوسرا انعام ہے "غَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ" اللہ کی رحمت ان کو ڈھانپ لیتی ہے اس کا عاشقانہ ترجمہ یہ ہے کہ: اللہ کی رحمت اپنے آغوش میں لے کر ذاکرِین کو پیار کر لیتی ہے۔

ذکر کا تیسرا انعام ہے "نَزَلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِيْنَةِ" کہ اُن پر سکینہ نازل ہوتی ہے۔ یہ وہی سکینہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت "هُوَ الَّذِىْ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِىْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ" میں بیان فرمایا ہے بس اس آیت شریفہ اور حدیثِ مبارکہ کو ملا کر جو ایک علمِ عظیم اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ ذکر کے لئے سکینہ لازم ہے اور سکینہ کے لئے زیادتِ ایمان لازم ہے، پس ذکرُ اللہ ازدیادِ ایمان، ترقئ ایمان یعنی حصولِ نسبتِ خاصہ مع اللہ کا ذریعہ ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں عمل کی توفیق دے اور ہمیں وہ دردِ دل عطا فرمادے جو اپنے اولیاء کو نصیب فرمایا ہے۔

(ماخوذ: وعظ "نزولِ سکینہ" حضرت مولانا حکیم محمد اختر صاحب)

سورۂ فاتحہ کے فضائل اور خصوصیات

سورۂ فاتحہ کو قرآن کریم میں بہت سی خصوصیات حاصل ہیں۔

❶ ...... اوّل یہ کہ قرآن کریم اسی سورۂ فاتحہ سے شروع ہوتا ہے، نماز اسی سے شروع ہوتی ہے اور نزول کے اعتبار سے بھی سب سے پہلی سورت جو مکمل طور پر نازل ہوئی یہی سورۃ ہے۔ سورۂ اقراء، سورۂ مزمل اور سورۂ مدثر کی چند آیات ضرور اس سے پہلے نازل ہو چکی تھیں، مگر مکمل سورت سب سے پہلے سورۂ فاتحہ ہی نازل ہوئی ہے، شاید اسی وجہ سے اس سورت کا نام بھی فاتحۃ الکتاب رکھا گیا ہے۔

❷ ...... دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ سورت ایک حیثیت سے پورے قرآن کریم کا متن اور سارا قرآن کریم اس کی شرح ہے۔ خواہ اس وجہ سے کہ پورے قرآن کے مقاصد، ایمان اور عملِ صالح میں دائر ہیں اور ان دونوں چیزوں کے بنیادی اصول اس سورت میں بیان کردئے گئے ہیں، اسی وجہ سے سورۂ فاتحہ کے نام اُم القرآن، اُم الکتاب اور قرآن عظیم بھی احادیث صحیحہ میں آئے ہیں۔

یا اس وجہ سے کہ اس سورۃ میں اس شخص کے لئے جو قرآن کی تلاوت یا مطالعہ شروع کرے، ایک خاص ہدایت دی گئی ہے کہ وہ اس کتاب کو اپنے تمام پچھلے خیالات ونظریات سے خالی الذہن ہو کر خاص طلبِ حق اور راہِ راست کی جستجو کے لئے پڑھے اور دیکھے اور اللہ تعالیٰ سے یہ دعاء بھی کرے کہ صراطِ مستقیم کی ہدایت عطا ہو۔

شروع سورت میں اُس ذات کی حمد و ثنا کا بیان ہے جس کی بارگاہ میں یہ درخواستِ ہدایت پیش کرتا ہے اور اسی درخواست کا جواب پورا قرآن ہے جو ”الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتَابُ“ سے شروع ہوتا ہے۔ گویا انسان نے جو اللہ تعالیٰ سے راہِ راست طلب کی تھی، اس کے جواب میں ”ذٰلِكَ الْكِتَابُ“ فرما کر اشارہ کر دیا گیا کہ جو تم

مانگتے ہو وہ اس کتاب میں موجود ہے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ سورۂ فاتحہ کی نظیر نہ تورات میں نازل ہوئی، نہ انجیل اور زبور میں اور نہ خود قرآنِ کریم میں کوئی دوسری سورۃ اس کی مثل ہے۔

سورۂ فاتحہ کا نام حدیث میں سورۂ شفا بھی آیا ہے۔ (معارف القرآن)

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ

لفظ مالک مِلک سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں کسی چیز پر ایسا قبضہ کہ وہ اس میں تصرف کرنے کی جائز قدرت رکھتا ہو (قاموس)۔ لفظ ''دِین'' کے معنی جزاء دینا۔ ''مٰلِكَ يَوْمِ الدِّيْنِ'' کا لفظی ترجمہ ہوا ''مالک روزِ جزا کا'' یعنی روزِ جزاء میں ملکیت رکھنے والا۔ وہ ملکیت کس چیز پر ہوگی؟ اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔ تفسیر کشاف میں ہے کہ اِس میں اشارہ عموم کی طرف ہے، یعنی روزِ جزاء میں تمام کائنات اور تمام امور کی ملکیت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہوگی۔ (کشاف)

روزِ جزاء کی حقیقت اور عقلاً اس کی ضرورت

اوّل یہ کہ روزِ جزاء کس دن کا نام ہے اور اس کی کیا حقیقت ہے؟ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ملکیت تمام کائنات پر جس طرح روزِ جزا میں ہوگی، ایسے ہی آج بھی ہے تو پھر روزِ جزاء کے ذکر کرنے کی کیا خصوصیت ہے؟

پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ روزِ جزاءُ اس دن کا نام ہے، جس دن کو اللہ تعالیٰ نے نیک و بد اعمال کا بدلہ دینے کے لئے مقرر فرمایا ہے۔ لفظ ''روزِ جزاء'' سے ایک عظیم الشان فائدہ یہ حاصل ہوا کہ دُنیا نیک و بد اعمال کی جزا و سزا کی جگہ نہیں، بلکہ یہ دارالعمل یعنی فرض ادا کرنے کا دفتر ہے، تنخواہ یا صلہ وصول کرنے کی جگہ نہیں۔ اِس سے معلوم ہو گیا کہ دُنیا میں کسی کو عیش و عشرت، دولت و راحت سے مالا مال دیکھ کر یہ

نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اللہ کے نزدیک مقبول ومحبوب ہے، یا کسی کو رنج ومصیبت میں مبتلا پاکر یہ نہیں قرار دیا جاسکتا کہ وہ اللہ کے نزدیک معتوب ومبغوض ہے۔

دنیا کے دفتروں اور کارخانوں میں کسی کو اپنا فرض ادا کرنے میں مصروفِ محنت دیکھا جائے تو کوئی عقلمند اس کو مصیبت زدہ نہیں کہتا اور نہ وہ خود اپنی مشقت کے باوجود اپنے آپ کو گرفتارِ مصیبت سمجھتا ہے، بلکہ وہ اس محنت ومشقت کو اپنی سب سے بڑی کامیابی تصوّر کرتا ہے اور کوئی مہربان اس کو اِس مشقت سے سبکدوش کرنا چاہے تو وہ اس کو اپنا بدترین دشمن خیال کرتا ہے، کیونکہ وہ اس تیس روزہ محنت کے پس پردہ اُس راحت کو دیکھ رہا ہے جو اُس کو تنخواہ کی شکل میں ملنے والی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اِس دنیا میں انبیاء علیہم السلام اور ان کے بعد اولیاء اللہ سب سے زیادہ مصیبت و بلا میں مبتلا ہوتے ہیں اور وہ اپنی اِس حالت پر نہایت مطمئن اور بسا اوقات مسرور نظر آتے ہیں۔

الغرض دنیا کا عیش وعشرت حق وصداقت کی، اور رنج ومصیبت بدعملی کی یقینی علامت نہیں ہے ہاں کبھی کبھی کسی عمل کی جزا یا سزا کا ہلکا سا نمونہ دُنیا میں بھی ظاہر کردیا جاتا ہے، وہ اس کا پورا بدلہ نہیں ہوتا، محض متنبہ کرنے کے لئے ایک نمونہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

﴿وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِنَ الْعَذَابِ الْأَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾ (السجدہ:۲۱)

تَرْجَمَہ: ''ہم لوگوں کو (آخرت کے) بڑے عذاب سے پہلے (بعض اوقات) دنیا میں ایک عذاب قریب کا مزہ چکھا دیتے ہیں تاکہ وہ باز آجائیں۔''

الغرض دُنیا کی راحت ومصیبت بعض اوقات تو امتحان اور آزمائش ہوتی ہے اور بعض اوقات عذاب بھی ہوتی ہے، مگر وہ عمل کا پورا بدلہ نہیں ہوتا، بلکہ ایک نمونہ ہوتا

ہے۔ کیونکہ یہ سب کچھ چند روزہ اور محض عارضی ہے۔ مدار و معیار وہ راحت و کلفت ہے جو ہمیشہ قائم رہنے والی ہے اور جو اس عالم سے گزر کر عالمِ آخرت میں آنے والی ہے اسی کا نام روزِ جزاء ہے۔ اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ نیک و بد عمل کا پورا بدلہ اس دُنیا میں نہیں ملتا تو عدل و انصاف اور عقل کا تقاضہ ہے کہ نیک و بد، اچھا اور برا، برابر نہ رہے، بلکہ ہر ایک کو اس کے عمل کی جزا یا سزا ملنا چاہیئے۔

اس لئے ضروری ہے کہ اس عالَم کے بعد کوئی دوسرا عالَم ہو، جس میں ہر چھوٹے بڑے اور اچھے برے عمل کا حساب اور اس کی جزا یا سزا انصاف کے مطابق ملے۔ اِسی کو قرآنِ کریم کی اصطلاح میں روزِ جزاء یا قیامت یا آخرت کہا جاتا ہے۔

قرآنِ کریم نے خود اس مضمون کو سورۂ مومن میں وضاحت سے فرمایا ہے:

﴿وَمَا يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۵ وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَلَا الْمُسِيْءُ ط قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝﴾

(سورۂ مومن ۵۹)

ترجمہ: ”بینا اور نابینا اور (ایک) وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے اور (دوسرے) بدکردار باہم برابر نہیں ہو سکتے، تم لوگ بہت ہی کم سمجھتے ہو، قیامت تو ضرور ہی آکر رہے گی۔ (تاکہ ہر ایک عمل کا پورا پورا بدلہ اس کو مل جائے) اس کے آنے میں کسی طرح کا شک ہے ہی نہیں، مگر اکثر لوگ نہیں ایمان لاتے۔“

مالک کون ہے؟

”مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ“ میں دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ ہر اہلِ عقل کے نزدیک یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ کائنات کے ذرّے ذرّے کی حقیقی مالک وہی ذات پاک ہے جس نے ان کو پیدا کیا، بڑھایا، تربیت کی اور جس کی ملکیت ہر چیز پر مکمل ہے۔

ظاہر پر بھی، باطن پر بھی، زندہ پر بھی، مردہ پر بھی اور جس کی ملکیت کی نہ کوئی ابتدا ہے نہ انتہا۔ بخلاف انسان کی ملکیت کے کہ وہ ابتدا و انتہا کے دائرے میں محدود ہے۔ اِس کی ملکیت اشیاء کے ظاہر پر ہے، باطن پر نہیں۔ زندہ پر ہے، مردہ پر نہیں۔ اس لئے ہر اہلِ بصیرت کے نزدیک صرف روزِ جزاء ہی کی نہیں، بلکہ دُنیا میں بھی تمام کائنات کی حقیقی ملکیت صرف حق تعالیٰ ہی کی ہے۔

پھر اس آیت میں اللہ تعالیٰ کو خاص روزِ جزاء کا مالک فرمانے میں کیا حکمت ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی دوسری آیت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں بھی اگرچہ حقیقی ملکیت اور مکمل ملکیت تمام کائنات پر صرف پروردگارِ عالم ہی کی ہے، لیکن اُسی نے اپنے کرم اور حکمتِ بالغہ سے ایک قسم کی ناقص ملکیت انسان کو بھی عطا فرما رکھی ہے اور دُنیا کے قوانین میں اس کی ملکیت کا کافی احترام بھی کیا گیا ہے۔

آج کی دُنیا میں انسان مال و دولت کا مالک ہے، زمین و جائیداد کا مالک ہے، کوٹھی، بنگلہ اور فرنیچر کا مالک ہے، یہ ناقص سی ملکیت جو اس کو محض آزمائش کے لئے دی گئی تھی وہ اسی میں مغرور و بدمست ہوگیا۔ اِس آیت میں حق تعالیٰ نے ”مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ“ فرما کر اِس مغرور غافل انسان کو آگاہ فرمایا کہ یہ ملکیتیں اور سب تعلقات و روابط صرف چند روز کے لئے ہیں۔

ایک ایسا دن آنے والا ہے جس میں کوئی کسی چیز کا ظاہری طور پر بھی مالک نہ رہے گا، نہ کوئی کسی کا خادم رہے گا نہ مخدوم، نہ کوئی کسی کا آقا رہے گا نہ غلام، تمام کائنات کی مِلک اور مُلک صرف ایک ذاتِ پاک (اللہ) ہی کی ہوگی۔

اس آیت کی پوری تفسیر اور روزِ جزاء کی وضاحت سورۂ مومن کی ان آیات میں ہے:

﴿یَوْمَ هُمْ بَارِزُوْنَ ۚ لَا یَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَیْءٌ ؕ لِمَنِ الْمُلْكُ الْیَوْمَ ؕ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝ اَلْیَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ

بِمَا كَسَبَتْ ؕ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۷﴾

(سورۂ مومن ۱۶، ۱۷)

ترجمہ: ''جس دن سب لوگ (اللہ کے) سامنے آموجود ہوں گے (کہ) ان کی بات اللہ سے (صورۃً) بھی مخفی نہ رہے گی، آج کے روز کس کی حکومت ہوگی؟ بس اللہ ہی کی ہوگی جو یکتا اور غالب ہے، آج ہر شخص کو اُس کے کئے کا بدلہ دیا جائے گا۔ آج کسی پر ظلم نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والے ہیں۔'' (معارف القرآن)

ہدایت کے درجات کی تفصیل

پہلی قابلِ غور بات یہ ہے کہ صراطِ مستقیم کی ہدایت کے لئے جو دعا اس آیت ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ'' میں تعلیم فرمائی گئی ہے، اس کے مخاطب جس طرح تمام انسان اور عام مومنین ہیں، اسی طرح اولیاء اللہ اور حضرات انبیاء علیہم السلام بھی اس کے مامور ہیں، جو بلاشبہ ہدایت یافتہ، بلکہ دوسروں کے لئے ہدایت کا سرچشمہ ہیں، پھر اس حاصل شدہ چیز کی بار بار دعاء مانگنے کا کیا مطلب ہے؟

اس کا جواب ہدایت کی پوری حقیقت معلوم کرنے پر موقوف ہے۔

لفظ ہدایت کی بہترین تشریح امام راغب اصفہانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ''مفردات القرآن'' میں تحریر فرمائی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

ہدایت کے اصلی معنی ہیں کسی شخص کو منزلِ مقصود کی طرف مہربانی کے ساتھ رہنمائی اور ہدایت کرنا۔ اور یہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کا فعل ہے، اور اس ہدایت کے مختلف درجات ہیں۔

پہلا درجہ: ایک درجہ ہدایت کا عام ہے جو کائنات و مخلوقات کی تمام اقسام، جمادات، نباتات، حیوانات وغیرہ کو شامل ہے۔

یہاں یہ خیال نہیں کرنا چاہئے کہ ان بے جان، بے شعور چیزوں کو ہدایت سے کیا کام! کیونکہ قرآنی تعلیمات سے یہ واضح ہے کہ کائنات کی تمام اقسام اور ان کا ذرّہ ذرّہ اپنے اپنے درجے کے موافق حیات و احساس بھی رکھتا ہے اور عقل و شعور بھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ جوہر کسی نوع میں کم اور کسی میں زیادہ ہے۔ اسی وجہ سے جن اشیاء میں یہ جوہر بہت کم ہے اُن کو بے جان، بے شعور سمجھا اور کہا جاتا ہے، احکامِ الٰہیہ میں بھی ان کے ضعفِ شعور کا اتنا اثر آیا کہ اُن کو احکام کا مکلّف نہیں بنایا گیا، جن مخلوقات میں حیات کے آثار تو نمایاں ہیں، مگر عقل و شعور نمایاں نہیں۔ ان کو ذی حیات، جان دار مگر بے عقل و شعور کہا جاتا ہے اور جن میں حیات کے ساتھ عقل و شعور کے آثار بھی نمایاں نظر آتے ہیں ان کو "ذَوِی العُقُول" کہا جاتا ہے اور اسی اختلافِ درجات اور عقل و شعور کی کمی بیشی کی وجہ سے تمام کائنات میں احکامِ شرعیہ کا مکلّف صرف انسان اور جنّات کو قرار دیا گیا ہے، اس لئے کہ ان میں عقل و شعور مکمل ہے، مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ دوسری انواع و اقسام میں حیات و احساس یا عقل و شعور بالکل نہیں، کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ؕ﴾

(بنی اسرائیل: ۴۴)

ترجمہ: "کوئی چیز ایسی نہیں جو تعریف کے ساتھ اس کی پاکی (قالاً یا حالاً) بیان نہ کرتی ہو، لیکن تم لوگ ان کی پاکی بیان کرنے کو سمجھتے نہیں ہو۔"

اس ہدایتِ عامہ کا نتیجہ ہے کہ کائناتِ کے تمام انواع و اصناف اپنا اپنا مقرّرہ فرض نہایت سلیقہ سے ادا کر رہے ہیں۔ جو چیز جس کام کے لئے بنا دی گئی ہے، وہ اس کو ایسی خوبی کے ساتھ ادا کر رہی ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔

زبان سے نکلی ہوئی آواز کے معنی کا ادراک نہ ناک کرسکتی ہے، نہ آنکھ، حالانکہ یہ

دونوں اعضاء زبان سے زیادہ قریب ہیں۔ اس ادراک کا فریضہ اللہ تعالیٰ نے کانوں کے سپرد کیا ہے۔ اسی طرح کانوں سے دیکھنے یا سونگھنے کا کام نہیں لیا جا سکتا۔

سورۂ مریم میں اسی مضمون کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

﴿ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ۝ ﴾

(مریم:۹۳)

ترجمہ: ''کوئی نہیں آسمان اور زمین میں جو نہ آئے رحمٰن کا بندہ ہو کر۔''

دوسرا درجہ: دوسرا درجہ ہدایت کا اس کے مقابلہ میں خاص ہے۔ یعنی صرف ان چیزوں کے ساتھ مخصوص ہے جو عرف میں ذوی العقول کہلاتی ہیں۔ یعنی انسان اور جن۔ یہ ہدایت انبیا اور آسمانی کتابوں کے ذریعہ ہر انسان کو پہنچتی ہے، پھر کوئی اس کو قبول کر کے مومن و مسلم ہو جاتا ہے اور کوئی رد کر کے کافر ٹھہرتا ہے۔

تیسرا درجہ: تیسرا درجہ ہدایت کا اس سے بھی زیادہ خاص ہے کہ صرف مومنین و متقین کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہ ہدایت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلاواسطہ انسان پر فائض ہوتی ہے، اس ہدایت کا دوسرا نام توفیق ہے۔ یعنی ایسے اسباب اور حالات پیدا کر دینا کہ قرآنی ہدایات کا قبول کرنا اور ان پر عمل کرنا آسان ہو جائے اور ان کی خلاف ورزی دشوار ہو جائے۔ اس تیسرے درجے کی وسعت غیر محدود اور اس کے درجات غیر متناہی ہیں، یہی درجہ انسان کی ترقی کا میدان ہے، اعمالِ صالحہ کے ساتھ ساتھ اس درجۂ ہدایت میں زیادتی ہوتی رہتی ہے۔ قرآنِ کریم کی متعدد آیات میں اس زیادتی کا ذکر ہے مثلاً:

﴿ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ﴾ (العنکبوت:۶۹)

ترجمہ: ''جو لوگ ہمارے راستے میں مجاہدہ کرتے ہیں، ہم ان کو اپنے راستوں کی مزید ہدایت کر دیتے ہیں۔''

یہی وہ میدان ہے جہاں ہر بڑے سے بڑا نبی و رسول اور ولی آخر عمر تک زیادتیِ

ہدایت وتوفیق کا طالب نظر آتا ہے۔

درجاتِ ہدایت کی اس تشریح کے بعد اب یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہدایت ایک ایسی چیز ہے جو سب کو حاصل بھی ہے اور اس کے مزید درجاتِ عالیہ حاصل کرنے سے کسی بڑے سے بڑے انسان کو استغناء بھی نہیں۔ اسی لئے سورۂ فاتحہ کی اہم ترین دعاء ہدایت کو قرار دیا گیا جو ایک ادنیٰ مومن کے لئے بھی مناسبِ حال ہے اور بڑے سے بڑے رسول اور ولی کے لئے بھی اُتنی ہی اہم ہے۔

ہدایت کی اس تشریح سے فہمِ قرآن میں بہت سے فوائد حاصل ہوگئے۔

۱ ...... یہ کہ قرآن میں کہیں تو ہدایت کو ہر مومن و کافر کے لئے بلکہ کل مخلوقات کے لئے عام فرمایا گیا ہے اور کہیں اس کو محض متقین کے ساتھ مخصوص لکھا گیا، جس میں ناواقف کو تعارض کا شبہ ہوسکتا ہے۔ ہدایات کے عام و خاص درجات معلوم ہونے کے بعد یہ شبہ خود بخود رفع ہوجاتا ہے کہ ایک درجہ سب کو عام اور شامل ہے اور دوسرا درجہ مخصوص ہے۔

۲ ...... یہ کہ قرآن میں ایک طرف تو جگہ جگہ یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالمین اور فاسقین کو ہدایت نہیں فرماتے اور دوسری طرف مکرّر یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کو ہدایت فرماتے ہیں۔ اس کا جواب بھی درجات کی تفصیل سے واضح ہوگیا کہ ''ہدایتِ عامہ'' سب کو کی جاتی ہے اور ہدایت کا تیسرا مخصوص درجہ ظالمین و فاسقین کو نصیب نہیں ہوتا۔

۳ ...... یہ کہ ہدایت کے تین درجات میں سے پہلا اور تیسرا درجہ بلا واسطہ حق تعالیٰ کا فعل ہے، اس میں کسی نبی یا رسول کا دخل نہیں۔ انبیاء علیہم السلام اور رسولوں کا کام صرف دوسرے درجۂ ہدایت سے متعلق ہے الغرض ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ'' ایک جامع اور اہم ترین دعا ہے، جو ہر انسان کو سکھلائی گئی ہے۔ دین اور دنیا دونوں میں صراطِ مستقیم کے بغیر فلاح و کامیابی ممکن نہیں۔ (معارف القرآن)

صِرَاطِ مُسْتَقِیْم منعم علیھم کا راستہ ہے

﴿اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ﴾

ترجمہ: ”اے اللہ ہم کو سیدھا راستہ دکھا۔“

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں صراطِ مستقیم کیا ہے؟ اس کا بدل ”صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ“ ہے یعنی اے اللہ! جن پر آپ نے انعام نازل کیا، جو آپ کے پیارے بندے ہیں، ان کا راستہ دکھا۔ گویا اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ سیدھے راستہ کا خواب محض کتابوں اور اسبابِ دنیویہ سے مت دیکھنا بلکہ سیدھا راستہ ان کا ہے جن کو میں نے انعام سے نوازا ہے، جو میرے مقرب بندے ہیں۔

انعام یافتہ بندے کون ہیں؟

قرآنِ کریم میں ارشاد ہے: ”اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ“ وہ لوگ ہیں جن پر انعام کیا۔ ”مِنَ النَّبِیّٖنَ“ جن کو نبوت عطا کی ”وَالصِّدِّیْقِیْنَ“ جن کو اپنا صدیق بنایا ”وَالشُّهَدَآءِ“ جن کو جام شہادت نوش کرنے کا شرف بخشا ”وَالصّٰلِحِیْنَ“ جن کو نیک اور صالح بنایا۔ تو نبوت، صدیقیت، شہادت اور صالحیت چار درجات ہیں، سیدھے راستہ سے ان کا راستہ مراد ہے، ان کا راستہ ہی صراط مستقیم ہے جو اللہ تک پہنچاتا ہے۔ جو ان کی راہ پر نہ چلے گا، اللہ تک نہیں پہنچ سکتا۔

صراط مستقیم کے لئے ”منعم علیہم“ بندوں کی رفاقت شرط ہے۔

”منعم علیہم“ اپنے اور ”مغضوب علیہم“ غیر ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں دیکھو یہ نبیین، صدیقین، شہداء، وصالحین ہمارے اپنے ہیں، لیکن ”غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ“ جن پر ہمارا غضب نازل ہوا، یہ غیر ہیں۔ دیکھو غیروں سے مت ملنا۔ یہ گمراہ لوگ ہیں۔ خبردار! ان کو غیر سمجھنا اور ان کے اعمال کو بھی غیر سمجھنا۔

اب منعم علیہم یعنی نبیین، صدیقین، شہداء، اور صالحین کی تفسیر دیکھئے۔

نبی کی تعریف

"مِنَ النَّبِيِّنَ" جن کو ہم نے نبوّت سے نوازا۔ یعنی جن انسانوں پر فرشتہ اللہ کی طرف سے وحی لے کر آتا تھا۔ مگر نبوت کا دروازہ اب بند ہو چکا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں اور تمام نبیوں کے سردار ہیں۔ اب قیامت تک کوئی نبی نہیں آئے گا۔

شہید کی تعریف

شہداء وہ لوگ ہیں جن کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات پر ایسا یقین آیا کہ اللہ کی راہ میں جان دے کر اللہ تعالیٰ کے وجود اور وحدانیت کی گواہی دے گئے۔ اُحد کے دامن میں ستر صحابہ ایک ہی دن میں شہید ہو گئے۔

صالحین کی تعریف

صالحین کے معنی مختصراً یہ ہیں کہ جن کی طبیعت میں ایسی سلامتی وصلاحیت ہو کہ وہ ہر وقت اتباعِ سنت اور اتباعِ شریعت کرتے رہیں اور اللہ کو راضی کرنے کی فکر میں رہیں۔ ایسے لوگ صالح کہلاتے ہیں۔

اب صدیقین کی تفسیر دیکھئے جو اولیاء اللہ کا سب سے اونچا طبقہ ہے۔ ہم اور آپ آج ارادہ کر لیں کہ جب ہمارا تعلق مالکِ کریم سے ہے تو اس اللہ سے ہم ولایتِ صدیقیت کا سوال کریں۔

آپ اللہ تعالیٰ سے ولایتِ صدیقیت مانگئے کہ اے اللہ! ہمیں اولیائے صدیقین میں شامل فرما۔ جب اللہ تعالیٰ قبول فرمالیں گے تو اعمال صدیقین، اخلاق صدیقین، ایمان صدیقین، یقین صدیقین، کیفیاتِ احسانیہ صدیقین جیسی عطا فرما دیں گے۔ آپ اللہ سے مانگ کر تو دیکھئے۔

اولیاء اللہ میں سب سے بڑا درجہ صدیقین کا ہے

لہٰذا نبوّت کے بعد جو سب سے بڑا درجہ اولیاء اللہ کا ہے، ہم سب کو وہی درجہ اللہ

تعالیٰ سے مانگنا چاہئے کہ اے اللہ! نبوت کا دروازہ بند ہوا ہے، صدیقین کا دروازہ بندہ نہیں ہوا، قیامت تک کھلا ہوا ہے۔ صدیقین قیامت تک پیدا ہوتے رہیں گے، لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسا اب کوئی صدیق نہیں ہوگا۔ ان کے درجہ کو اب کوئی نہیں پہنچ سکتا، لیکن صدیقین پیدا ہوتے رہیں گے۔ اے اللہ! ہم کو نسبتِ صدیقی عطا فرمادے، اولیائے صدیقین میں شامل فرمادے۔

صدیقین کی تعریف

صدیقین کون لوگ ہیں؟ صدیق وہ اللہ کا ولی ہوتا ہے کہ نبی پر جو کچھ وحی نازل ہو، اس کا دل خود بخود اس کی تصدیق کرے یعنی صدیقین آئینۂ نبوت ہوتا ہے۔ علامہ آلوسی رحمہ اللہ تعالیٰ نے تفسیر روح المعانی میں صدیق کی یہ تعریف کی ہے:

❶ .....جس کا قال اور حال ایک ہو۔

"اَلَّذِیْ لَا یُخَالِفُ قَالُهٗ حَالَهٗ"

صدیق وہ ہے جس کے قول اور حالِ میں فرق نہیں ہوتا۔ جو زبان پر ہے وہی دل میں ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقامِ صدیقیت کو شاہ عبدالغنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ: ایک دن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: جب میں قیامت کے دن دوزخ اور جنت کو دیکھوں گا، تو میرا ایمان ایک ذرّہ نہیں بڑھے گا، اتنا ایمان مجھے دنیا ہی میں حاصل ہے، بہ صدقۂ صحبتِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اتنا یقین تو مجھے دنیا میں ہی حاصل ہے۔

شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مرشد حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو خط لکھا تھا کہ: حضرت آپ کی غلامی کے صدقے میں اللہ نے میرا ایمان و یقین اس مقام پر عطا فرمایا ہے کہ جب میں دُنیا کی زمین پر چلتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ میں

آخرت کی زمین پر چل رہا ہوں۔

❷ جس کا باطن ظاہری حالات سے متاثر نہ ہو۔

"اَلَّذِی لَا یَتَغَیَّرُ بَاطِنُهٗ مِنْ ظَاهِرِهٖ"

جس کا باطن (اتنا زبردست اور قوی ہو کہ) ظاہری حالات سے متاثر نہ ہوتا ہو۔ یعنی چاہے کچھ بھی ہو جائے لیکن کبھی مغلوب نہ ہوتا ہو۔ یہ نہ کہے کہ کیا کریں بھائی ایسے حالات ہیں۔ یا خاندان کی وجہ سے مروّت آگئی، اس وجہ سے ویڈیو فلم بنوالی۔ لندن کی سڑک ہو یا جاپان کی، اللہ والے جہاں بھی جاتے ہیں، اللہ والے ہی رہتے ہیں، یہ دلیل ہے کہ ان کے دل میں اللہ موجود ہے۔ پس صدیق کا ایمان اس قدر قوی ہوتا ہے کہ ظاہری حالات سے متاثر نہیں ہوتا، کسی سے مرعوب نہیں ہوتا۔ لوگوں سے ڈر کر اللہ کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کرتا۔

اور صدیق کی تیسری تعریف ہے۔

❸ .....دونوں جہان خدا پر فدا کرنے والا۔

"اَلَّذِیْ یَبْذِلُ الْکَوْنَیْنَ فِیْ رِضَا مَحْبُوْبِهٖ"

صدیق وہ ہے جو دونوں جہان اپنے محبوب کی خوشنودی پر فدا کرتا ہے۔

"آخرت کو (محبوب اللہ) پر فدا کرنے کے معنیٰ" آخرت کو اللہ پر فدا کرنے کا یہ طریقہ ہے کہ نیک کام اللہ کی رضا کے لئے کرو۔ جنت کی لالچ میں نہ کرو۔ اللہ کی رضا درجۂ اولین میں ہو۔ جنت کو درجۂ ثانوی میں کرلو۔ نیت یہ ہو کہ یا اللہ! میں یہ عمل جنت کے لئے نہیں کر رہا ہوں، آپ کو خوش کرنے کے لئے کر رہا ہوں، لیکن چونکہ جنت آپ کا محلِ لقاء اور محلِ دیدار ہے، اس لئے جنت کا بھی سوال کرتا ہوں، لیکن مقصود آپ کی رضا ہے۔ بس اس طرح آپ نے آخرت فدا کردی، جنت کو اللہ پر فدا کردیا۔

اور دوزخ کے ڈر سے گناہ مت چھوڑو بلکہ اللہ کی ناراضگی کے خوف سے چھوڑو۔ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے بچنے کے لئے گناہ چھوڑو اور جہنم کو درجۂ ثانوی میں کرلو۔ یہ

نیت کرنے سے آپ نے جنت وجہنم اور آخرت کو اللہ پر فدا کر دیا۔

حدیث پاک ہے۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

﴿اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَلُکَ رِضَاکَ وَالْجَنَّۃَ﴾

تَرْجَمَہ: ''اے اللہ میں تجھ سے تیری رضا (اور تیری خوشی مانگتا ہوں) اور جنت (کو بعد میں) مانگتا ہوں۔''

جنت کو دوسرے درجہ پر رکھا، اللہ کی رضا کا پہلے سوال کیا۔

﴿وَاَعُوْذُ بِکَ مِنْ سَخَطِکَ وَالنَّارِ﴾

تَرْجَمَہ: ''اور میں تیری ناراضگی اور دوزخ سے پناہ چاہتا ہوں۔''

دوزخ کو درجۂ ثانوی کیا، پہلے اللہ کی ناراضگی سے پناہ مانگی۔

اس حدیث سے بات سمجھ میں آ گئی کہ آخرت کو یوں فدا کیا جاتا ہے۔ بس دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق دے۔ اے اللہ! ہم سب کو سلامتی اعضاء اور سلامتی ایمان کے ساتھ حیات نصیب فرما اور سلامتیٔ اعضاء اور سلامتیٔ ایمان کے ساتھ دنیا سے اٹھا۔ یہ دعا ہمارے لئے، ہمارے بچوں، ہمارے خاندان، ہمارے دوستوں اور سارے عالم کے مسلمانوں کے لئے قبول فرما۔

یا اللہ! ہم سب کے لئے تقویٰ کے راستہ کو آسان فرما دیجئے۔ یا اللہ! گناہوں کو چھوڑنا آسان فرما دیجئے اور ہم سب کو اللہ کی رضا والی حیات نصیب فرما دیجئے۔

یا اللہ! گناہوں کو چھوڑ کر ہم ایک بار نہیں بلکہ کروڑ ہا بار شکر ادا کریں۔

اے مالک! اگر ساری دنیا کے ذرّات زبان بن جائیں اور ان کے ذریعے ہم تیرا شکر ادا کرنا چاہیں پھر بھی ہم تیرا شکر ادا نہیں کر سکتے۔ یا اللہ! ہمیں گناہوں کو چھوڑ دینے کی توفیق عطا فرما دیجئے۔ یا اللہ! ہم آپ سے دونوں جہانوں کی نعمتوں کی بھیک مانگتے ہیں، ہماری دعا قبول فرما لیجئے۔

(بیان مولانا حکیم محمد اختر صاحب ۱۵ اگست ۱۹۹۴)

جنت کے خزائنِ خاص کی دو آیتیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْہِ مِنْ رَّبِّہٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ط کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ قف لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ قف وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ق غُفْرَانَکَ رَبَّنَا وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ ۝ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا ط لَھَا مَا کَسَبَتْ وَعَلَیْھَا مَا اکْتَسَبَتْ ط رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِیْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ج رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَیْنَا اِصْرًا کَمَا حَمَلْتَہٗ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِنَا ج رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَالَا طَاقَۃَ لَنَا بِہٖ ج وَاعْفُ عَنَّا وقفة وَاغْفِرْلَنَا وقفة وَارْحَمْنَا وقفة اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ ۝﴾ (البقرۃ: ۲۸۵،۲۸۶)

ترجمہ: ”رسول ایمان لایا اُس چیز پر جو اُس پر اُس کے رب کی جانب سے اتاری گئی اور مومنین ایمان لائے۔ یہ سب ایمان لائے اللہ پر، اُس کے فرشتوں، اُس کی کتابوں اور اُس کے رسولوں پر۔ (ان کا اقرار ہے) کہ ہم خدا کے رسولوں میں کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی، اے پروردگار! ہم تیری مغفرت کے طلبگار ہیں اور تیری ہی طرف لوٹنا ہے۔ اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ اسی کو ملتا ہے جو اس نے کمایا اور اسی پر پڑتا ہے جو اس نے کیا۔ اے ہمارے رب! نہ پکڑ ہم کو اگر ہم بھولیں یا چوکیں، اے رب ہمارے! اور نہ رکھ ہم پر بوجھ بھاری جیسا رکھا تھا ہم سے پہلے لوگوں پر،

اے رب ہمارے! اور نہ اٹھوا ہم سے وہ بوجھ کہ جس کی ہم کو طاقت نہیں اور درگزر کر ہم سے اور بخش ہم کو، اور رحم کر ہم پر، تو ہی ہمارا رب ہے، مدد کر ہماری کافروں پر۔''

ان دو آیتوں کے خاص فضائل

یہ سورۂ بقرہ کی آخری دو آیات ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے رات کو یہ دو آیتیں پڑھ لیں تو یہ اس کے لئے کافی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ نے دو آیتیں جنت کے خزائن میں سے نازل فرمائی ہیں، جس کو تمام مخلوق کی پیدائش سے دو ہزار سال پہلے خود رحمٰن نے اپنے ہاتھ سے لکھ دیا تھا، جو شخص ان کو عشاء کی نماز کے بعد پڑھ لے، تو وہ اس کے لئے قیام اللیل یعنی تہجد کے قائم مقام ہو جاتی ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اللہ نے سورۂ بقرہ کو ان دو آیتوں پر ختم فرمایا ہے جو مجھے اس خزانۂ خاص سے عطا فرمائی گئی ہیں جو عرش کے نیچے ہے۔ اس لئے تم خاص طور پر ان آیتوں کو سیکھو اور اپنی عورتوں اور بچوں کو بھی سکھاؤ۔

آخری دو آیتوں میں سے پہلی آیت میں اطاعت شعار مومنین کی مدح کی گئی ہے، جنہوں نے اللہ جل شانہٗ کے تمام احکام پر لبیک کہا اور تعمیل کے لئے تیار ہو گئے۔

اور دوسری آیت میں ایک شبہ کا جواب دیا گیا جو ان دو آیتوں سے پہلی آیت میں صحابۂ کرام کو پیدا ہو گیا تھا اور ساتھ ہی اپنے فضل اور رحمتِ بے حساب کا ذکر فرمایا گیا۔ وہ شبہ یہ تھا کہ ''جو تمہارے دلوں میں ہے تم اس کو ظاہر کرو یا چھپاؤ، ہر حال میں اللہ تعالیٰ تم سے اس کا حساب لیں گے۔'' صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم یہ سن کر گھبرا اٹھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اب

تک تو ہم یہ سمجھتے تھے کہ ہم جو کام اپنے ارادہ و اختیار سے کرتے ہیں، انہیں اعمال کا حساب ہوگا، غیر اختیاری خیالات کا حساب نہ ہوگا، مگر اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر خیال پر حساب ہوگا۔ اس میں تو عذاب سے نجات پانا دشوار ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اگرچہ آیت کی صحیح مراد معلوم تھی، مگر آپ نے اپنی طرف سے کچھ کہنا پسند نہ فرمایا، بلکہ وحی کا انتظار کیا اور صحابۂ کرام کو یہ تلقین فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حکم آئے خواہ آسان ہو یا دشوار، مومن کا کام یہ نہیں ہے کہ اس کے ماننے میں ذرا بھی تامل کرے، تم کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام احکام سن کر یہ کہو۔

﴿سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ﴾

ترجمہ: ''اے ہمارے پروردگار! ہم نے آپ کا حکم سنا اور اس کی اطاعت کی، اے ہمارے پروردگار! اگر حکم کی تعمیل میں ہم سے کوئی کوتاہی ہوئی ہو تو اس کو معاف فرما دے۔ کیونکہ ہم سب کا آپ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔''

صحابۂ کرام نے ایسا ہی کیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ کی آخری یہ دونوں آیتیں نازل فرمائیں۔

﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ ..... رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ﴾

اس میں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح فرمائی اور بجائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لینے کے لفظ رسول فرما کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و تشریف کو واضح کر دیا۔ اس کے بعد فرمایا ''وَالْمُؤْمِنُوْنَ'' یعنی جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وحی پر ایمان و اعتقاد ہے، اس طرح عام مومنین کا بھی اس وحی پر اعتقاد ہے۔

مومنین کے ایمان کا علیحدہ تذکرہ کیا گیا ہے، اس میں اشارہ ہے کہ اگرچہ نفسِ ایمان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور سب مسلمان شریک ہیں، لیکن درجاتِ ایمان کے اعتبار سے ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم مشاہدہ اور

سماع کی بنا پر ہے اور مسلمانوں کا علم ایمان بالغیب ہے۔

اس کے بعد اُس ایمان مجمل کی تفصیل بتلائی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور عام مومنین میں شریک تھا کہ وہ ایمان تھا اللہ تعالیٰ کے موجود اور ایک ہونے پر اور تمام صفاتِ کاملہ کے ساتھ متصف ہونے پر، اور فرشتوں کے موجود ہونے پر اور اللہ تعالیٰ کی کتابوں اور سب رسولوں کے سچے ہونے پر۔

اس کے بعد اس کی وضاحت فرمائی کہ اس امت کے مومنین پچھلی امتوں کی طرح ایسا نہ کریں گے کہ اللہ کے رسولوں میں باہمی تفرقہ ڈالیں کہ بعض کو نبی مانیں اور بعض کو نہ مانیں، جیسے یہود نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اور نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نبی مانا، مگر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی نہ مانا۔ اِس اُمت کی یہ مدح فرمائی کہ یہ اللہ کے کسی رسول کا انکار نہیں کرتے اور پھر صحابۂ کرام کے اس جملہ پر ان کی تعریف کی گئی جو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے موافق زبان سے کہا تھا۔

﴿سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ﴾

اس کے بعد دوسری آیت میں ایک خاص انداز سے وہ شبہ دور کیا گیا جو پچھلی آیت کے بعض جملوں سے پیدا ہوسکتا تھا کہ دل میں چھپے ہوئے خیالات پر حساب ہوا تو عذاب سے کیسے بچیں گے؟

ارشاد فرمایا "لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا" یعنی اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زائد کام کا حکم نہیں دیتے، اس لئے غیر اختیاری طور پر جو خیالات اور وسوسے دل میں آجائیں اور پھر ان پر کوئی عمل نہ ہو تو وہ سب اللہ تعالیٰ کے نزدیک معاف ہیں۔

جس طرح انسان کے اعمال وافعال جو ہاتھ، سر، آنکھ اور زبان وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں جن کو اعمالِ ظاہرہ کہا جاتا ہے، ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک اختیاری جیسے

ارادہ سے بولنا، ارادے سے مارنا، ارادے سے دیکھنا، ارادے سے سننا اور دوسرے غیر اختیاری جیسے زبان سے کہنا کچھ چاہتے تھے اور نکل گیا کچھ یا رعشہ کی وجہ سے ہاتھ سے کسی کو تکلیف پہنچ گئی، تو ان غیر اختیاریہ افعال پر ثواب یا عذاب نہ ہوگا۔ اسی طرح وہ افعال جن کا تعلق باطن یعنی دل کے ساتھ ہے، ان کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک اختیاری جیسے کفر و شرک کا عقیدہ جس کو قصد و اختیار کے ساتھ دل میں جمایا ہے یا اپنے آپ کو بڑا سمجھنا یا پختہ ارادہ کرنا کہ شراب پیوں گا، اور دوسرے غیر اختیاری امور مثلاً دل میں کسی برے خیال کا آجانا۔

ان میں بھی غیر اختیاریہ افعال پر عذاب و ثواب نہ ہوگا۔

اس مضمون کو آخر میں اور زیادہ واضح کرنے کے لئے فرمایا کہ:

﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ﴾

یعنی انسان کو ثواب بھی اُس کام کا ہوتا ہے جو ارادہ سے کرے اور عذاب بھی اُس کام کا ہوتا ہے جو ارادہ سے کرے۔

مراد یہ ہے کہ ابتداءً بلا واسطہ اُس عمل کا ثواب یا عذاب ہوگا جو قصد و ارادہ سے کرے، مثلاً آدمی کوئی نیک کام ایسا کرے جس سے دوسرے لوگوں کو بھی نیکی کی توفیق ہوجائے، تو جب تک لوگ یہ کام کرتے رہیں گے اس کا ثواب پہلے والے کو ملتا رہے گا۔

اسی طرح اگر کسی شخص نے کوئی طریقۂ گناہ جاری کیا تو آئندہ جتنے لوگ اس گناہ میں مبتلا ہوں گے اس کا وبال اس شخص کو بھی ہوگا جس نے اول یہ برا طریقہ جاری کیا تھا۔

آخر میں قرآنِ کریم نے مسلمانوں کو ایک خاص دعا کی تلقین فرمائی جس میں بھول چوک اور بلا واسطہ خطاءً کسی فعل کے سرزد ہونے کی معافی طلب کی گئی۔

یہ سب دعائیں حق تعالیٰ نے قبول فرمانے کا اظہار بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ کردیا۔ (معارف القرآن)

مسلمان کے عقائد

عقیدہ مضبوط گرہ کی طرح ٹھوس نظریہ اور یقینی بات کا نام ہے، جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو۔ عقیدہ اگر قرآن وسنت اور اجماعِ اُمت کے مطابق ہے تو درست ہے اور اسی کا نام ایمان ہے۔ ایمان اور صحیح عقیدہ کے ساتھ معمولی نیک کام بھی کیا جائے گا تو اس پر باقاعدہ ثواب ملے گا۔ اگر عقیدہ غلط ہے یا اس میں کفر وشرک کی آمیزش ہے تو بڑے سے بڑا نیکی کا کام بھی مقبول نہ ہوگا۔ نماز، حج، صدقات، روزے وغیرہ سب کچھ ضائع ہوجائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾

ترجمہ: ''اگر وہ شرک کرتے تو ان کے سب اعمال برباد ہوجاتے۔''

عقیدہ کی مثال بیج کی ہے اگر بیج اچھا ہو تو پھل بھی اچھا ہوگا۔ اگر بیج برا اور ناقص ہو تو پھل بھی ناقص ہوگا۔ اگر بیج محض چھلکا ہو اس میں مغز اور گودا نہ ہو تو کچھ بھی پیدا نہ ہوگا۔ مسلمان کے بنیادی عقائد سات ہیں جن کا بیان ایمانِ مفصل میں ہے۔

۱. ایمان باللہ یعنی عقیدۂ توحید۔
۲. فرشتوں پر ایمان۔
۳. آسمانی کتابوں پر ایمان۔
۴. اللہ کے پیغمبروں پر ایمان۔
۵. قیامت پر ایمان۔
۶. اچھی بری تقدیر پر ایمان۔
۷. مرنے کے بعد جینے اور جزا وسزا پر ایمان۔

عقیدۂ توحید

خدا تعالیٰ کے متعلق مندرجہ ذیل باتوں پر ایمان لانا ضروری ہے:

۱. اللہ ایک ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں، نہ وہ کسی سے پیدا ہوا، نہ اس سے کوئی پیدا ہوا جسے نور من نور اللہ اور ابن اللہ تسلیم کیا جائے اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے۔

۲. وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

۳. کوئی چیز اس جیسی نہیں، نہ وہ کسی چیز جیسا ہے، وہ سب سے نرالا ہے، نہ وہ کسی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، نہ کوئی اس کا روپ دھار سکتا ہے۔

۴. تمام جہان پہلے نہ تھے، اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے سے موجود ہوئے، اس لئے جہان کو حادث کہتے ہیں۔

۵. وہ زندہ اور قیوم ہے۔

۶. وہ ہر چیز پر قادر ہے، جو چاہے سو کرتا ہے۔

۷. وہ عالم الغیب والشہادہ ہے۔ کائنات کا کوئی ذرہ اس سے پوشیدہ نہیں ہے۔

۸. وہ سب کو دیکھتا اور سنتا ہے۔

۹. بغیر لفظ اور آواز کے کلام فرماتا ہے۔

۱۰. وہی عبادت کے لائق ہے۔

۱۱. غائبانہ پکار و دعا اسی کا خاصہ ہے۔

۱۲. وہی اپنے بندوں کی دعائیں سنتا ہے اور ان کو سب آفات سے بچاتا ہے۔ ذات و صفات اور کمالات میں اس کا کوئی ساجھی نہیں ہے۔ اپنے بندوں پر مہربان ہے۔ سب کا آقا، داتا، اور بادشاہ ہے۔

۱۳ سب عیبوں سے پاک ہے۔ وہی عزت والا ہے، عزت دیتا ہے، بڑائی والا ہے۔ کائنات کی ہر چیز کا خالق ہے۔

۱۴ گناہوں کو بخشنے والا ہے۔

۱۵ وہاب (بہت دینے والا) ہے۔

۱۶ زبردست ہے۔

۱۷ روزی دینے والا ہے۔ جس کی چاہے روزی تنگ کرے، جس کی چاہے کشادہ کرے، جس کو چاہے پست کرے، جس کو چاہے بلند کرے، جس کو چاہے عزت دے، جس کو چاہے ذلت دے۔

۱۸ عدل اور انصاف والا ہے۔ کسی پر ظلم نہیں کرتا، مگر بردبار اور برداشت والا ہے۔ جلدی نہیں پکڑتا، مگر جب پکڑتا ہے تو سخت پکڑتا ہے، کوئی اس سے چھڑا نہیں سکتا۔

۱۹ خدمت کی قدردانی کرنے والا ہے۔

۲۰ وہ سب کا کارساز ہے، اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔

۲۱ اسی نے پہلے سب کو پیدا کیا اور قیامت کو وہی دوبارہ پیدا کرے گا۔

۲۲ وہی جلاتا ہے، وہی مارتا ہے۔

۲۳ اس کو نشانیوں اور صفتوں سے سب جانتے ہیں، مگر اُس کی ذات کی باریکی اور حقیقت کو کوئی نہیں جان سکتا۔

دل میں تو آتا ہے، سمجھ میں نہیں آتا بس جان گیا میں تیری پہچان یہی ہے

۲۴ گنہگاروں کی توبہ قبول فرماتا ہے، نافرمانوں کو سزا دیتا ہے۔

۲۵ وہی ہدایت کرتا ہے۔

۲۶ وہ نہ سوتا ہے نہ اونگھتا ہے، تمام عالم کی حفاظت سے تھکتا نہیں۔

۲۷ وہی مشکل کشا اور حاجت روا ہے۔

۲۸ وہی مختار کل یعنی قادرِ مطلق ہے۔

۲۹ وہی متصرف و پروردگار ہے۔ فتح وشکست دینا، اولاد دینا، دے کر واپس لے لینا، مقدمہ میں کامیاب وناکام کرنا، ملازمت دینا اور چھیننا اسی کا کام ہے۔

۳۰ نفع ونقصان پہنچانے والا ہے۔

۳۱ بارش برسانا، ہوائیں چلانا اسی کا کام ہے،

۳۲ رحمت یا عذاب نازل کرنا اسی کے اختیار میں ہے،

۳۳ جہان کا مدبر ومنتظم وہی ہے،

۳۴ عرش سے فرش تک اور ثریٰ سے ثریا تک تمام عالم کی نگرانی کرنا سب کچھ اسی کا کام ہے۔ وہی فریادرس اور غوث الاعظم ہے۔

۳۵ وہی سجدہ اور طواف کے لائق ہے۔

۳۶ وہی نذر ومنّت کا مستحق ہے۔

۳۷ اسی کا نام، ہردم ذکر اور وِرد کے لائق ہے۔

۳۸ اسی کا قانون محکم اور اٹل ہے۔

۳۹ اس پر کبھی فنا نہ ہوگی۔

۴۰ آسمان وزمین کی ہر چیز کا مالک وہی ہے۔

(ماخوذ۔ مسلمان کسے کہتے ہیں؟ مصنف۔ مولانا حافظ مہر محمد)

”لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ“ کی فضیلت

کلمۂ طیبہ جس کو کلمۂ توحید بھی کہا جاتا ہے، جس کثرت سے اس کا ذکر قرآنِ پاک اور حدیث شریف میں کیا گیا ہے، شاید ہی اس کثرت سے کوئی دوسری چیز ذکر کی گئی ہو۔ قرآنِ پاک میں مختلف عنوانات اور مختلف ناموں سے اس پاک کلمہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ قولِ ثابت کلمۂ تقویٰ ”مَقَالِیْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ“ (آسمانوں اور زمینوں کی کنجیاں) وغیرہ الفاظ سے ذکر کیا گیا ہے۔

امام غزالی نے احیاء العلوم میں نقل کیا ہے کہ یہ کلمۂ توحید ہے، کلمۂ اخلاص ہے، کلمۂ تقویٰ ہے، کلمۂ طیبہ ہے، ”عُرْوَةُ الْوُثْقٰی“ ہے ”دَعْوَةُ الْحَقِّ“ ہے ”ثَمَنُ الْجَنَّةِ“ ہے۔

”لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ“ کا ”اَفْضَلُ الذِّکْر“ ہونا تو ظاہر ہے اور بہت سی احادیث میں کثرت سے وارد ہوا ہے۔ نیز سارے دین کا مدار ہی کلمۂ توحید پر ہے۔ یہ وہ پاک کلمہ ہے کہ دین کی چکّی اسی کے گرد گھومتی ہے۔

چونکہ یہ پاک کلمہ دین کی اصل ہے، ایمان کی جڑ ہے، اس لئے جتنی بھی اس کی کثرت کی جائے گی، اتنی ہی ایمان کی جڑ مضبوط ہوگی۔ ایمان کا مدار اسی کلمہ پر ہے بلکہ دُنیا کے وجود کا مدار اسی کلمہ پر ہے۔ چنانچہ صحیح حدیث میں وارد ہے کہ قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوسکتی جب تک ”لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ“ کہنے والا کوئی زمین پر ہو۔

ترجمۂ حدیث: ”حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک مرتبہ

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا سب سے زیادہ نفع اٹھانے والا قیامت کے دن کون شخص ہوگا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: مجھے احادیث پر تمہاری حرص دیکھ کر ہی گمان تھا کہ اس بات کو تم سے پہلے کوئی دوسرا شخص نہ پوچھے گا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سوال کا جواب ارشاد فرمایا کہ سب سے زیادہ سعادت منداور نفع اٹھانے والا میری شفاعت کے ساتھ وہ شخص ہوگا جو دل کے خلوص کے ساتھ ”لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ“ کہے۔“

(رواہ البخاری)

ترجمۂ حدیث: ”حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میں ایک ایسا کلمہ جانتا ہوں کہ کوئی بندہ ایسا نہیں ہے کہ دل سے حق سمجھ کر اس کو پڑھے اور اسی حال میں مرجائے، مگر وہ جہنم پر حرام ہوجائے۔ وہ کلمہ ”لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ“ ہے۔“ (رواہ الحاکم)

ترجمۂ حدیث: ”حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ”لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ“ کا اقرار کرنا جنت کی کنجیاں ہیں۔“ (رواہ احمد)

ترجمۂ حدیث: ”حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ عرش کے سامنے نور کا ایک ستون ہے۔ جب کوئی شخص ”لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ“ کہتا ہے تو وہ ستون ہلنے لگتا ہے۔ اللہ کا ارشاد ہوتا ہے کہ ٹھہر جا۔ وہ عرض کرتا ہے کیسے ٹھہروں؟ حالانکہ ابھی تک کلمۂ طیبہ پڑھنے والے کی مغفرت نہیں ہوئی۔ ارشاد ہوتا ہے کہ اچھا میں نے اس کی مغفرت کردی تو وہ ستون ٹھہر جاتا ہے۔“ (رواہ الترغیب، فضائل اعمال)

ترجمۂ حدیث: ”حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص بھی اس حال میں مرے کہ ”لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ“ کی دل

سے شہادت دیتا ہو، ضرور جنت میں داخل ہوگا۔ دوسری حدیث میں ہے کہ ضرور اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرما دیں گے۔"

(احمد ونسائی والحاکم والترمذی)

کلمۂ طیبہ کا سراسر نور و سرور ہونا بہت سی روایات سے معلوم و مفہوم ہوتا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ نے منبّہات میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ اندھیرے پانچ ہیں اور پانچ ہی ان کے لئے چراغ ہیں:

1. دُنیا کی محبت اندھیرا ہے، جس کا چراغ تقویٰ ہے۔
2. گناہ اندھیرا ہے، جس کا چراغ توبہ ہے۔
3. قبر اندھیرا ہے جس کا چراغ "لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلَ اللّٰهِ" ہے۔
4. آخرت اندھیرا ہے، جس کا چراغ نیک عمل ہے۔
5. پل صراط اندھیرا ہے، جس کا چراغ یقین ہے۔

رابعہ عدویہ رحمہ اللہ تعالیٰ مشہور وَلیّہ ہیں، رات بھر نماز میں مشغول رہتیں، صبح صادق کے بعد تھوڑی دیر سو رہتیں اور جب صبح کا چاندنا اچھی طرح ہو جاتا، تو گھبرا کر اٹھتیں اور نفس کو ملامت کرتیں کہ کب تک سوتا رہے گا؟ عنقریب قبر کا زمانہ آنے والا ہے، جس میں صور پھونکنے تک سونا ہی ہوگا۔ جب انتقال کا وقت قریب ہوا، تو ایک خادمہ کو وصیت فرمائی کہ یہ اونی گدڑی (جس کو وہ تہجد کے وقت پہنا کرتی تھیں اس) میں مجھے کفن دے دینا اور کسی کو میرے مرنے کی خبر نہ کرنا۔ چنانچہ حسبِ وصیت تجہیز و تکفین کر دی گئی۔ بعد میں اس خادمہ نے خواب میں دیکھا کہ وہ نہایت عمدہ لباس پہنے ہوئے ہیں۔ اس نے دریافت کیا کہ: وہ آپ کی گدڑی کہاں گئی جس میں کفن دیا گیا تھا؟ فرمایا کہ لپیٹ کر میرے اعمال کے ساتھ رکھ دی گئی۔ انہوں نے درخواست کی کہ مجھے کوئی نصیحت فرمائیں۔ کہا کہ اللہ کا ذکر جتنا بھی کر سکو کرتی رہو کہ اس کی وجہ سے تم قبر میں قابل رشک بن جاؤ گی۔

متعدد احادیث میں یہ بھی ارشاد نبوی وارد ہوا ہے کہ جس شخص کو مرتے وقت "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" نصیب ہوجائے اس کے گناہ ایسے گر جاتے ہیں، جیسے سیلاب کی وجہ سے تعمیر۔ بعض احادیث میں یہ بھی آیا ہے کہ جس شخص کو مرتے وقت یہ کلمہ نصیب ہو جاتا ہے تو پچھلی خطائیں معاف ہوجاتی ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ اپنے مردوں کو "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" کا توشہ دیا کرو۔

حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص کسی بچہ کی پرورش کرے یہاں تک کہ وہ "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" کہنے لگے، اس سے حساب معاف ہے۔

ایک حدیث میں وارد ہے کہ جنت کی قیمت "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہُ" ہے۔

"سُبْحَانَ اللّٰہِ" سو۱۰۰ بار پڑھیں تو اس کا ثواب ایسا ہے گویا تم نے سو۱۰۰ عربی غلام آزاد کئے۔

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" سو۱۰۰ مرتبہ پڑھیں تو اس کا ثواب ایسا ہے گویا تم نے سو۱۰۰ گھوڑے مع سامان لگام وغیرہ جہاد میں سواری کے لئے دے دئے۔

"اَللّٰہُ اَکْبَرْ" سو۱۰۰ مرتبہ پڑھنے کا ثواب ایسا ہے گویا تم نے سو۱۰۰ اونٹ قربانی میں ذبح کئے اور وہ قبول ہوگئے۔

اور "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ" سو۱۰۰ مرتبہ پڑھنے کا ثواب ایسا ہے گویا اس کے ثواب نے تمام زمین و آسمان کو بھر دیا۔ اس سے بڑھ کر کسی کا کوئی عمل نہیں جو مقبول ہو۔

اتنے آسان الفاظ سے اللہ کو یاد کیا کریں۔ محنت ہے نہ مشقت، لیکن ثواب ہی ثواب ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو ذکر کی کثرت کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔

(فضائلِ اعمال)

شرک کی قباحت

گناہوں کی تعداد کا کوئی شمار نہیں اور گناہوں میں سے بعض گناہ ایسے ہیں جو چھوٹے ہیں اور بعض بڑے۔ اور بڑے گناہوں میں سے کچھ گناہ ایسے ہیں جو بہت ہی بڑے ہیں اور جو گناہ تمام گناہوں میں سب سے بڑا ہے وہ اللہ کے ساتھ شرک کرنا ہے۔

امام بخاری اور امام مسلم رحمہ اللہ تعالیٰ بیان فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس حدیث کو روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! تمام گناہوں میں سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ جس اللہ نے تجھے پیدا فرمایا ہے تو اس کے برابر کسی کو شریک کرے۔

امام بخاری اور امام مسلم رحمہ اللہ تعالیٰ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی حدیث کو روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا میں تمہیں تمام گناہوں میں سے ایک ایسا گناہ نہ بتلاؤں جو تمام گناہوں میں سب سے بڑا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ تین مرتبہ ارشاد فرمائے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں ضرور بتلایئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کے ساتھ شرک کرنا اور والدین کی نافرمانی کرنا۔ اس حدیث پاک سے بھی معلوم ہوا کہ تمام گناہوں میں سب سے بڑا گناہ جو پہلے نمبر پر ہے وہ ہے اللہ کے ساتھ شرک کرنا۔

آج کی اس نشست میں اللہ کی توفیق سے شرک ہی کے متعلق کچھ باتیں بیان کی جارہی ہیں۔ اور جو بات یہاں بیان کرنی ہے اس کا پہلا نکتہ یہ ہے کہ شرک کیا ہے؟ شرک سے مراد یہ ہے کہ اللہ کی ذات اور اللہ کی صفات میں کسی غیر کو اللہ کا شریک ٹھہرانا یا اللہ کا ہمسر ٹھہرانا۔ رکوع سجود اور قیام صرف اللہ کے لئے ہے، اللہ کے سوا کسی اور کے آگے جھکنا، اللہ کے سوا کسی اور کو سجدہ کرنا سراسر شرک ہے۔ تمام معاملات اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہیں، اللہ کے سوا کسی انتقال شدہ کو دستگیر کہنا، مشکل کشا کہنا، مدد کے لئے پکارنا، سب صورتیں شرک کی ہیں۔ نذر و نیاز اللہ کے لئے ہے، اللہ کے سوا کسی اور کے لئے نذر و نیاز دینا یہ سب شرک ہے۔ قسم صرف اللہ کی کھانا چاہئے، اللہ کے سوا کسی اور کی قسم کھانا یہ سب شرک ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ یہ جاننا چاہئے شرک کے متعلق قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے کیا بیان فرمایا ہے؟ قرآنِ کریم میں شرک کی سنگینی، شرک کی خرابی اور شرک کی بربادی بیان کرنے کے لئے بہت سی آیاتِ کریمہ آئی ہیں، ان میں سے چند ایک اللہ کی توفیق سے آپ کے سامنے پیش کی جارہی ہیں۔

❶ .....پہلی بات جو شرک کی سنگینی کو نمایاں کرتی ہے، یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے تمام انبیا علیہم السلام کو جو مبعوث فرمایا، ان کی دعوت کی اثاث یہ ٹھہری کہ وہ لوگوں کو شرک سے روکیں۔ اور ایک اللہ کی عبادت کی دعوت دیں۔ اللہ مالک الملک ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدُوْنِ﴾

ترجمہ: ”اور نہیں بھیجا ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول، مگر ہم نے اس کی طرف وحی کی کہ کوئی عبادت کے لائق نہیں مگر میں۔“ ”فَاعْبُدُوْنِ“ پس تم میری ہی عبادت کرو۔“

تمام انبیا کی دعوت کی اثاث اور بنیاد یہ ٹھہری کہ وہ لوگوں کو شرک سے روکیں اور ایک اللہ کی عبادت کی دعوت دیں۔

اللہ مالکُ الملک ارشاد فرماتے ہیں:

﴿قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْ لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا﴾ (الکہف:۱۱۰)

ترجمہ: ”آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیجیے کہ میں تمہاری طرح کا بشر ہوں، میری طرف یہ وحی کی جاتی ہے، بے شک تمہارا معبود ایک ہے، پس جو شخص اللہ کی ملاقات کی امید رکھے، اسے چاہئے کہ وہ نیک عمل کرے، اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے۔“

تو قرآنِ کریم سے شرک کے متعلق جو باتیں معلوم ہوتی ہیں، ان میں پہلی بات یہ ہے کہ تمام انبیاء کی دعوت کی بنیاد انسانیت کو شرک سے روکنا اور توحید کی طرف بلانا ہے، اور یہی دعوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی۔

❷ ......شرک سے متعلق ایک دوسری بات جو قرآنِ کریم سے معلوم ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ شرک اتنا تباہ کن گناہ ہے کہ جس کسی نے شرک کیا اس کے سابقہ تمام نیک اعمال برباد ہوگئے۔ ایک شخص بہت زیادہ نمازیں ادا کرتا ہے، روزے رکھتا ہے حج اور عمرے ادا کرتا ہے، صدقہ اور خیرات کرتا ہے ان تمام نیکیوں کے باوجود اگر اس نے شرک کرلیا تو شرک کی وجہ سے اس کی ساری نیکیاں برباد ہوجائیں گی۔

قرآنِ کریم میں اللہ مالکُ الملک ارشاد فرماتے ہیں۔

﴿وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾

ترجمہ: ”اور بے شک (آپ صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف وحی کی گئی اور

ان لوگوں کی طرف وحی کی گئی جو (آپ صلی اللہ علیہ وسلم) سے پہلے تھے۔ اگر آپ نے شرک کیا تو آپ کے اعمال برباد ہوجائیں گے۔ اور آپ ضرور نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوجائیں گے۔''

ذرا سوچئے یہ خطاب کس سے ہے؟ یہ خطاب امام انبیاء، خاتم المرسلین، محبوبِ ربّ العالمین صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء سے ہے، تو جب شرک کی وجہ سے ہمارے نبیِ محترم، دنیا کے قائد! اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء علیہم السلام کے اعمال برباد ہوسکتے ہیں تو ہماری کیا حیثیت ہے؟ حالانکہ ہمارے نبیِ محترم اور تمام انبیاء علیہم السلام شرک کرنے والے نہیں تھے۔ بات کو سمجھانے اور شرک کی سنگینی کو ذہن نشین کرانے کے لئے اللہ تعالیٰ یہ فرمارہے ہیں کہ "نَعُوْذُ بِاللّٰہ" اگر انبیاء علیہم السلام کے امام بھی شرک کرتے تو ان کے سارے اعمال بھی برباد ہوجاتے۔

۳ .....شرک سے متعلق قرآنِ کریم میں تیسری بات یہ آئی ہے کہ شرک کرنے والا نجس اور ناپاک ہوجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

﴿یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْمُشْرِکُوْنَ نَجَسٌ فَلَا یَقْرَبُوْا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِھِمْ ھٰذَا ج﴾ (التوبہ:۲۸)

ترجمہ: ''اے ایمان والو یقیناً مشرک نجس ہیں اور وہ اِس سال کے بعد حرمت والی مسجد کے قریب بھی نہ بھٹکیں۔''

۴ .....شرک کے متعلق چوتھی بات یہ ہے کہ اہلِ ایمان کو یہ حکم ہے کہ وہ مشرکوں کی صحبت میں نہ رہیں، مشرکوں کی صحبت سے دور رہیں۔

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ''مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔ اور فرمایا ایماندار جو باندی ہے وہ شرک کرنے والی آزاد عورت سے اچھی ہے، اگرچہ وہ آزاد عورت تمہیں پسند ہو۔''

پھر فرمایا مشرک مَردوں سے نکاح نہ کرو یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں اور

ایماندار غلام اس آزاد مرد سے اچھا ہے جو شرک کرنے والا ہے اگرچہ وہ شرک کرنے والا مرد تمھیں بھلا محسوس ہو۔ اور فرمایا یہ جو مشرک مرد اور شرک کرنے والی عورتیں ہیں، یہ جہنم کی آگ کی طرف دعوت دیتی ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے حکم کے ساتھ جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے اور اللہ تعالیٰ لوگوں کے لئے اپنی آیات کو کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت پکڑیں۔

اس طرح اہل ایمان کو حکم ہے کہ وہ مُشرک مرد اور مُشرک عورتوں کی صحبت نہ اختیار کریں۔ ہاں اگر کوئی شخص مشرکوں کی مجلسوں میں اس غرض سے جائے یا مشرکوں کو اپنی مجلس میں اس غرض سے بلائے کہ ان کو دین کی دعوت دینی ہے یا شرک سے روکنا ہے تو یہ بات درست ہے، لیکن ان سے دوستی رکھنا ان سے تعلق رکھنا، اسلام میں اس بات کی اجازت نہیں۔

۵ ...... شرک سے متعلق پانچویں بات قرآن کریم میں یہ ہے کہ اگر کوئی شخص شرک کی حالت میں مر گیا اور اس نے توبہ نہ کی تو کل قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس کے شرک کو معاف نہ فرمائیں گے، شرک کے سوا جتنے گناہ ہوں گے اللہ تعالیٰ چاہے تو معاف کر دے۔

قرآنِ کریم میں اللہ مالکُ الملک فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰى اِثْمًا عَظِيْمًا﴾

ترجمہ: ”یقیناً اللہ اس بات کو معاف نہیں فرمائے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے۔ اور شرک کے سوا دوسرے جو گناہ ہیں جس کو چاہیں گے معاف کر دیں گے اور جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا اس نے بہت بڑا بہتان کیا۔“

۶ ...... شرک کے متعلق قرآنِ کریم میں چھٹی بات یہ ہے کہ مُشرک پر اللہ نے

جنت کو حرام کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوٰىهُ النَّارُ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ﴾

ترجمہ: ''یقیناً جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا اس پر جنت حرام ہے اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہے اور ظالموں کے لئے کوئی مددگار نہیں۔''

۷ ...... شرک کے متعلق ساتویں بات قرآنِ کریم میں ہے کہ جو شخص شرک کی حالت میں مر جائے اور شرک سے توبہ نہ کرے تو ایمان والوں کو اس بات کی اجازت نہیں کہ وہ اللہ سے اُس کے گناہوں کی معافی کا سوال کریں۔

اللہ تعالیٰ قرآنِ کریم میں ارشاد فرماتے ہیں:

﴿مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْا اُولِىْ قُرْبٰى مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحَابُ الْجَحِيْمِ﴾

(التوبہ:۱۱۳)

ترجمہ: ''نبی کے لئے اور اہلِ ایمان کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ شرک کرنے والوں کے لئے استغفار کریں اگرچہ وہ ان کے قرابت دار ہوں اس چیز کے واضح ہونے کے بعد کہ وہ جہنمی ہیں۔''

قرآنِ کریم میں شرک سے متعلق جو باتیں بیان کی گئی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے۔

۱ تمام انبیاء کی بعثت توحید کی طرف دعوت دینا اور شرک سے روکنا ہے۔

۲ شرک وہ تباہ کن گناہ ہے جو تمام نیکیوں کو برباد کر دیتا ہے۔

۳ شرک کی وجہ سے شرک کرنے والا ناپاک اور نجس ہو جاتا ہے۔

۴ مشرکوں سے اہلِ ایمان کو دور رہنا چاہیئے، نہ مشرک عورتوں سے نکاح ہو اور نہ مشرک مردوں سے۔

۵ جو شخص توبہ کے بغیر شرک کی حالت میں مر گیا قیامت کے دن اس کی معافی

نہیں۔

❻ مشرک پر جنت حرام ہے اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

❼ اہلِ ایمان اور انبیاء علیہم السلام کو یہ اجازت نہیں کہ وہ قیامت کے روز مشرک کی مغفرت کا سوال کریں۔

(ماخوذ: وعظ جناب فضل الٰہی صاحب، سعودی عرب)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿وَاَمَّا الَّذِیْنَ فَسَقُوْا فَمَاْوٰھُمُ النَّارُ ؕ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَآ اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَقِيْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۝﴾ (سورہ السجدہ: ۲۰)

ترجمہ: ''اور جنہوں نے نافرمانی کی تو ان کا ٹھکانا دوزخ ہے وہ جب اس سے باہر نکلنا چاہیں گے تو پھر اسی میں دھکیل دیئے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ دوزخ کا وہ عذاب چکھو جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔''

نماز

نماز اسلام کا ایک اہم رکن ہے۔ اسی سے مسلمان کی پہچان ہوتی ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جہاد کے لئے کسی بستی میں اترتے تو صبح کو اذان اور نماز کا انتظار کرتے، اگر کوئی اذان کی آواز نہ آتی تو خالص کافروں کی بستی سمجھ کر دعوتِ اسلام کے بعد ان سے جنگ کرتے۔ نماز ایمان والوں کی معراج ہے، کیونکہ سب عبادات زمین پر فرض ہوئی تھیں اور یہ عرش پر فرض ہوئی۔ جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام شب معراج میں اللہ کے حضور پہنچے، تو امت کے لئے نماز کا تحفہ لائے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن شریف میں نماز کا سات سو مرتبہ ذکر اور حکم فرمایا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے کہ:

﴿ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ ﴾

ترجمہ: ''نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو اور رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔''

ایک جگہ ارشادِ خداوندی ہے:

﴿ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَلَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ﴾

ترجمہ: ''نماز قائم کرو اور مشرکین میں سے نہ بنو۔''

قرآنِ کریم نے جہاں نیک بندوں کی صفات ذکر فرمائی ہیں، ان کی ایک صفت یہ بھی ذکر فرمائی ہے کہ:

﴿ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ ﴾

ترجمہ: ''قرآن ان متقیوں کا راہنما ہے جو غائبانہ (خدا و رسول اور قیامت وغیرہ پر) ایمان لاتے ہیں اور نماز کی پابندی کرتے ہیں اور ہمارے رزق سے خرچ کرتے ہیں۔''

نماز کی اہمیت کے متعلق چند ارشادات نبوی ملاحظہ ہوں:

١ سب سے پہلے نماز فرض ہوئی۔ قیامت کے دن سب سے پہلے نماز ہی کا حساب ہوگا۔

٢ نماز کے بارے میں اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو۔

٣ مسلمان اور مشرک کے درمیان فرق کرنے والی چیز نماز ہے۔

٤ نماز سے اگر کوئی چیز افضل ہوتی تو فرشتوں کو خدا اس کا حکم دیتا۔ فرشتے دن رات رکوع اور سجدے میں لگے ہوئے ہیں۔

٥ نماز دین کا ستون ہے۔

٦ نماز شیطان کا منہ کالا کرتی ہے۔

٧ نماز مومن کا نور ہے۔

٨ نماز افضل جہاد ہے۔

٩ جب آسمان سے آفت اترتی ہے تو مسجد آباد کرنے والوں سے ہٹ جاتی ہے۔

١٠ سجدہ کی جگہ اللہ نے آگ پر حرام کی ہے۔

١١ آدمی کو سب سے زیادہ خدا کا قرب سجدہ میں ہوتا ہے۔

١٢ جنت کی کنجیاں نماز ہیں۔

١٣ نماز کا مرتبہ دین میں ایسا ہے جیسے سر کا بدن میں ہے، نماز دل کا نور ہے، جو اپنے دل کو نورانی بنانا چاہے بنالے۔

١٤ جو شخص اچھی طرح وضو کرے اس کے بعد خشوع و خضوع سے دو چار رکعت نماز

فرض یا نفل پڑھ کر اللہ سے دعا مانگے یا اپنے گناہوں کی معافی مانگے تو اللہ جل شانہٗ معاف فرما دیتے ہیں۔

۱۵ جو شخص پانچوں نمازوں کا اہتمام کرتا ہے اور وضو، رکوع، سجود پورا کرتا ہے، جنت اس کے لئے واجب ہو جاتی ہے اور دوزخ اس پر حرام ہو جاتی ہے۔

(بحوالہ فضائل نماز صفحہ ۳۳۷)

نماز کی فضیلت

۱ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے ''اگر کسی شخص کے دروازے پر نہر بہتی ہو، وہ اس میں پانچ مرتبہ روزانہ غسل کرے، کیا اس کے بدن پر میل رہے گی؟'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فرمایا نہیں رہے گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پانچ نمازوں کی مثال بھی اسی نہر جیسی ہے کہ اللہ ان کے ذریعے گناہ مٹا دیتا ہے۔''

۲ ایک شخص نے غلطی سے ایک عورت کا بوسہ لے لیا، نادم ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی۔ اللہ نے یہ آیت اتاری:

﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ اللَّيْلِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ﴾

تَرجَمہ: ''دن کے دونوں کناروں میں نماز پڑھیں اور رات کے اوقات میں بھی، بے شک نیکیاں گناہوں کو مٹا ڈالتی ہیں۔''

اس شخص نے پوچھا کیا یہ میری خصوصیت ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں، یہ میری ساری اُمت کے لئے ہے۔

۳ پانچ نمازیں اور ایک جمعہ اگلے جمعہ تک اور ایک رمضان اگلے رمضان تک تمام چھوٹے گناہوں کا کفارہ بن جاتے ہیں، جب تک کبائر کا ارتکاب نہ کیا

جائے۔

❹ فرض نماز کا وقت آجائے تو جو مسلمان اچھی طرح وضو کر کے نماز کو عاجزی اور خشوع سے پڑھے، تو یہ نماز پہلے گناہ کا کفارہ ہوگی، جب تک کبیرہ گناہ کا ارتکاب نہ کرے۔

❺ جس نے فجر اور عصر کی نماز پابندی سے پڑھی وہ دوزخ میں نہ جائے گا۔

❻ جو صبح کی نماز پڑھے اللہ کی حفاظت میں ہے۔ اے ابنِ آدم دیکھنا اللہ تعالیٰ تجھ سے اس حفاظت کا بدل نہ مانگیں گے یعنی نماز کی پابندی برابر رکھو۔

❼ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: مجھے حکم ملا ہے کہ لوگوں سے جہاد کروں جب تک کہ وہ "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" کی گواہی نہ دے لیں، اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں، پس جب یہ کام کرلیں تو ان کے مال اور خون مجھ سے محفوظ رہیں گے، مگر اسلام کے حق کی وجہ سے (قصاص وحدود ان پر جاری ہوں گی) اور ان کے باطن کا حساب اللہ کے ذمے ہے۔

❽ ہمارے اور لوگوں کے درمیان امن کا معاہدہ نماز سے ہے، جس نے نماز چھوڑی تو اس نے کفر کیا۔

❾ اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے سوا کسی عمل کے ترک کو کفر نہ جانتے تھے۔

❿ انسان کا شرک وکفر کے درمیان ملاپ نماز کا چھوڑ دینا ہے۔ (ریاض الصالحین)

⓫ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے جو نماز کی پابندی کرے گا، قیامت کے دن نماز اس کے لئے نور، دلیل اور ذریعہ نجات ہوگی اور جو پابندی نہ کرے گا تو اس کے لئے کوئی نور، دلیل اور نجات نہ ہوگی۔ وہ قارون، فرعون، ہامان اور ابی ابنِ خلف کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ (مشکوۃ)

⓬ لوگو! پانچ نمازیں پڑھو، رمضان کے روزے رکھو، اپنے مالوں کی زکوٰۃ دو، اپنے

حاکموں کی اطاعت کرو، اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ (ترمذی)

۱۳ سات سال کی عمر میں اپنے بچوں کو نماز پڑھنے کا حکم دو اور جب دس سال کے ہو جائیں تو نماز نہ پڑھنے پر مار پیٹ کرو اور ان کو الگ الگ بستروں پر سلاؤ۔

(ابوداؤد)

۱۴ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات سے قبل بار بار فرمایا کہ نماز اور غلاموں کا خاص خیال رکھنا۔

۱۵ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عمال اور حکام کو سرکاری حکم بھیج کر متنبہ فرمایا کہ میرے نزدیک نماز تمہارے سب کاموں میں اہم ہے، جس نے نماز قائم کی، وہ دیگر امور کی بھی پابندی کرتا ہوگا اور جس نے نماز کا خیال نہ رکھا، اس سے اور کاموں میں کیا توقع ہو سکتی ہے۔؟

۱۶ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: جماعت کی نماز اکیلی نماز سے ۲۵ گنا زیادہ ثواب رکھتی ہے اور صبح کی نماز میں رات اور دن والے فرشتے بھی حاضر ہوتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے اگر چاہو تو پڑھ لو ”وَقُرْآنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا“ **ترجمہ:** ”اور فجر کے وقت قرآن پڑھنا بیشک فجر کی قرأت میں فرشتوں کی حاضری ہوتی ہے۔“

(مسلم شریف جلد ا صفحہ ۲۳۱)

۱۷ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: منافقوں کو عشاء اور صبح کی نماز پڑھنا مشکل معلوم ہوتی ہے، اگر وہ جانتے کہ ان میں کیا ثواب ہے، تو وہ گھٹنوں کے بل چل کر بھی نماز پڑھنے آتے۔ (مسلم)

۱۸ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالی عنہ کہتے ہیں: جسے یہ پسند ہو کہ وہ کل مسلمان ہو کر خدا کو ملے، تو ان پانچ نمازوں کی باجماعت پابندی کرے، جن کی اذان دی جاتی ہے، کیونکہ اللہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے

ہدایت کے طریقے بتائے ہیں اور یہ نمازیں ہدایت کا راستہ ہیں۔ اگر تم اپنے گھروں میں نمازیں پڑھنے لگو جیسے منافق گھر میں پڑھتا ہے تو تم نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت چھوڑ دی اور اگر تم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت چھوڑ دی تو گمراہ ہو جاؤ گے۔ جو آدمی اچھی طرح وضو کرتا ہے، پھر مسجد میں آتا ہے، تو ہر قدم کے بدلے اللہ ایک نیکی لکھتا ہے، ایک درجہ بلند کرتا ہے، ایک گناہ مٹا دیتا ہے، ہم نے اپنے زمانہ میں دیکھا کہ صرف اعلانیہ منافق ہی جماعت سے الگ رہتا اور مسلمان کو تو دو مسلمانوں کے سہارے لایا جاتا اور صف میں کھڑا کر دیا جاتا تھا۔ (مسلم)

بے نمازوں کو تنبیہہ

اے مسلمانو! نماز کی اہمیت اور اس کو ادا کرنے کی تاکید کا تقاضا یہ ہے کہ ہم کبھی اس میں سستی نہ کریں، خود بھی پڑھیں، اولاد سے بھی پڑھوائیں اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کریں تو انشاء اللہ ہمارا معاشرہ جرائم سے پاک ہو کر جنت کی نظیر بن جائے گا۔ کیونکہ اللہ پاک کا ارشاد ہے:

﴿اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ﴾ (العنکبوت:۴۵)

ترجمہ: ”آپ صلی اللہ علیہ وسلم تلاوت کریں اس کی جو آپ کی طرف وحی کی گئی اور نماز قائم کریں بے شک نماز برے اور بے حیائی کے کاموں سے روکتی ہے اور اللہ کا ذکر بہت بڑا ہے۔“

ہم سب اللہ کے بندے ہیں اور وہ ہمارا آقا و مولیٰ ہے۔ ہر غلام اپنے مالک کا فرمانبردار ہوتا ہے، یہ آزاد معزز انسان اگر خدا کا فرمانبردار اور نمازی نہ ہو تو یہ غلاموں اور نوکروں سے بھی نکما ہو گیا۔

آپ گائے، بکری، گدھا، گھوڑا وغیرہ پالتے ہیں اوران کو کچھ خوراک دیتے ہیں۔ پھر سارا وقت ان سے کام لیتے ہیں، وہ شوخی کریں، تو ڈنڈے مارتے ہیں۔ ہم ان سے ہزاروں گنا افضل ہیں، ہمارا مالک بھی سب کائنات کا مالک ہے، وہ تھوڑی دیر ہم سے عبادت چاہتا ہے، پھر سارا وقت کھانے کمانے کی آزادی دیتا ہے۔ اب اگر ہم نماز روزہ ادا کر کے اپنے مالک کو راضی نہ کریں، تو کیا ہم جانوروں سے بدتر نہ ہوجائیں گے؟ ہر جانور ایک قسم کی خوراک دوسروں کی محتاجی میں کھاتا ہے اور سر جھکا کر کھاتا ہے۔ ہم کئی قسم کے مرکب مرغن اور لذیذ کھانے اپنی مرضی سے تیار کر کے کھاتے ہیں، ہاتھ سے باعزت کھاتے ہیں، سر جھکانا نہیں پڑتا۔ کیا یہ عظیم الشان نعمت اور عزّت ہمیں اس پر آمادہ نہیں کرتی کہ ہم کھاتے وقت اپنے مولیٰ کو نہ بھولیں؟ اس کے در پر پیشانی جھکایا کریں۔ اگر غور کرو تو یہ عرشی، فرشی سب کائنات تمہاری خدمت میں لگی ہے، آسمان و بادل بارش برساتے ہیں، زمین فصل اُگاتی ہے، سورج اس کو پکاتا ہے، چاند کی خنک روشنی اس میں شیرینی پیدا کرتی ہے۔ تم اسے لوہے سے کاٹتے ہو، جانوروں کے ذریعے صاف کرتے ہو، پتھر کی چکی سے پیستے، پانی سے گوندھتے اور آگ ولکڑی سے پکاتے ہو، پھر دستر خوان بچھا کر اپنے بال بچوں کے ساتھ زبان و دہن کی ضیافت کرتے ہو۔ کیا ساری کائنات تو تمہاری خدمت و ضیافت کا سامان کرے، دست بستہ خادم دکھائی دے۔ مگر تم خدا کے ایک حکم کی بھی پابندی نہ کرو، بدستور شیطان کی تابعداری اور خدا کی نافرمانی کرتے رہو اور فانی زندگی کو عیش وعشرت کی نذر کرو، کیا انصاف کا تقاضہ یہی ہے؟۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبَيْنِ وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَاٰتٰكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ﴾ (القرآن)

ترجمہ: ''کہ ہم نے گھومنے والے چاند اور سورج بھی تمہارے کام میں لگا دیئے ہیں اور رات اور دن بھی تمہارے تابع کر دیئے ہیں اور اتنی نعمتیں تم کو دی ہیں کہ تم شمار نہ کر سکو۔ واقعی انسان بڑا بے انصاف اور ناشکرا ہے۔'' (رعد)

تعجب ہے! سور جیسا منحوس جانور صبح سویرے اٹھ کر اپنے خدا کو اپنی بولی میں یاد کرتا ہے، کتے جیسا رزیل جانور اپنے مالک کا مثالی وفادار ہوتا ہے۔ گھوڑا اپنے مالک کو دیکھ کر بے قابو ہو کر کلے پر کودنے اور ہنہنانے لگتا ہے۔ بکری گائے وغیرہ مالک کے سامنے دم ہلاتی اور اپنے مالک سے محبت کا اظہار کرتی ہیں۔ مگر خدا کی صنعت کا یہ شاہکار، بہترین شکل وصورت کا مالک حضرتِ انسان خدا کی تمام نعمتیں حاصل کر لینے کے باوجود ان جانوروں سے بدتر اور گھٹیا بن جاتا ہے؟ آٹھ بجے تک خوابِ غفلت میں پڑا رہتا ہے؟ پھر کھا پی کر دن بھر مرضی کے مشاغل میں گم ہو جاتا ہے۔ رات کو سینما، ٹی، وی، سی، آر اور کلبوں کے ذریعے اپنی ناجائز تفریح قلبی کا سامان کرتا ہے۔ پھر جانوروں کی طرح سو جاتا ہے۔ آپ ذرا غور کریں، ایسا انسان اپنے خالق و مالک کا بے وفا ہوا یا نہیں؟ ایسے ہی لوگ کیا اللہ کے اس فرمان کے مصداق نہیں ہیں؟

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا ز وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ز أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ط أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ﴾

(الاعراف:۱۷۹)

ترجمہ: ''اور ہم نے جہنم (میں جلنے) کے واسطے بہت سے جن اور انسان پیدا کیے ہیں، ان کے دل تو ہیں، مگر ان سے سمجھتے نہیں، اور ان کی آنکھیں تو ہیں مگر ان سے حق کو دیکھتے نہیں، اور ان کے کان تو ہیں، مگر ان

سے (خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بات) سنتے نہیں۔ یہ لوگ جانوروں جیسے ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ (اور گھٹیا) ہیں (کیونکہ) یہ لوگ غافل رہتے ہیں۔'' (پارہ ۹ رکوع ۱۲)

تو اے مسلمانو! رسولِ خدا کے اُمتی و غلام کہلانے والو! اور حضرت شفیع المذنبین صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کی تمنا رکھنے والو! اپنے اعمال و کردار کا جائزہ لو۔ نافرمانی اور عیاشی کی زندگی سے باز آ جاؤ، خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے فرمانبردار بن جاؤ، تاکہ اپنا کھویا ہوا وقار اور جہاں بانی کا منصب پھر سے حاصل کر سکو۔

(ماخوذ۔ ''مسلمان کسے کہتے ہیں؟'' مصنف۔ مولانا حافظ مہر محمد)

روزہ

رمضان شریف کے روزے رکھنا فرض ہے، اس کا تارک فاسق اور اس کا منکر کافر ہے۔ روزہ پہلی امتوں پر بھی مختلف دنوں میں فرض تھا۔ روزہ بدن کی ریاضت اور شہوت کو توڑنے اور تقویٰ وطہارت حاصل کرنے کا نسخۂ اکسیر ہے۔ جب بندہ خدا کے حکم سے جائز نعمتوں سے بھی دن میں رک جاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اسے گناہوں اور حرام چیزوں سے سال بھر بچنے کی توفیق دے دیتے ہیں۔ چونکہ یہ ایک منفی (نہ کھانے پینے کی) اطاعت ہے جو اس صفت کی بنا پر خدا سے مشابہت ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ اس شخص میں غنا، توکل، بردباری، بخشش وکرم اور عزم وحوصلہ کی خوبیاں پیدا کر دیتے ہیں۔ روزہ میں ریاکاری نہیں ہوتی، اس لئے تو اللہ تعالیٰ اس کی جزا خود مرحمت فرمائیں گے۔ ہر نیک عمل کا ثواب دس گنا سے سات سو گنا تک بقدر اخلاص دیا جاتا ہے۔ مگر روزہ کا ثواب اس سے بھی زیادہ ملتا ہے۔ (بخاری ومسلم)

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: ”جو شخص رمضان کا روزہ ایمان کی حالت میں، ثواب کے لئے رکھے گا، اللہ اس کے گناہ معاف کر دیں گے۔ نیز فرمان ہے جو رمضان کی راتوں میں قیام کرے (تراویح میں قرآن پڑھے اور سنے) تو اس کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ قیامت کے دن روزہ اور قرآن بندے کی سفارش کریں گے جو ان کی سفارش سے بخشا جائے گا۔

ریّان نام کا جنت میں خاص دروازہ ہے، جس میں سے صرف روزہ دار گزریں گے۔

(ماخوذ۔ مسلمان کسے کہتے ہیں؟ مصنف۔ مولانا حافظ مہر محمد)

روزہ کی حکمت

اللہ تعالیٰ نے روزہ کی حکمت یہ ارشاد فرمائی:

﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ (البقرہ:)

ترجمہ: ”اور تم متقی بن جاؤ۔“

اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے پاک وصاف ہو کر دنیا و آخرت میں عزت، راحت اور سکون کی زندگی پاؤ۔

روزہ اللہ تعالیٰ سے محبت پیدا کرنے، اس کی نافرمانیاں چھڑانے اور اس کے عذاب سے بچانے کا بہت قدیم اور موثر ترین نسخہ ہے۔

جو شخص گناہوں کی زندگی نہیں چھوڑتا، اس کے لئے دنیا جہنم بن جاتی ہے، اسے سکون نہیں ملتا۔ اللہ تعالیٰ کی مسلط کی ہوئی چیز سے کوئی کیسے نکل سکتا ہے؟

اللہ تعالیٰ براہِ راست اعلان فرما رہے ہیں، ایک بار نہیں بار بار اعلان فرمایا کہ: جو شخص نافرمانی کرتا ہے، میں اس پر پریشانی مسلط کر دیتا ہوں، اللہ کو اپنے بندوں سے بہت محبت ہے، وہ انہیں دنیا و آخرت کی جہنم سے بچانا چاہتے ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے گناہوں سے بچنے کی ہمت پیدا کرنے کے کئی نسخے عطا فرمائے ہیں۔ رمضان بھی انہیں نسخوں میں سے ایک نسخہ ہے۔

گناہ چھڑوانے کا مؤثر نسخہ

اب گناہ چھڑوانے کے اس نسخہ کو موثر کیسے بنایا جا سکتا ہے؟ کہنے کو تو یہ مختصر سا جواب ہے کہ ”رمضان میں روزہ رکھنا“ مگر در حقیقت اس نسخہ کے دس اجزاء ہیں اور ہر جزء اپنی جگہ مستقل نسخہ ہے۔

①......مراقبہ

روزہ تو رکھ لیا، مگر روزہ میں جو مراقبہ ہے، وہ نہیں کیا تو گناہ نہیں چھوٹیں گے۔ مراقبہ یہ ہے کہ آدمی غور کرے کہ لذت کی وہ تمام چیزیں جو غیر رمضان میں حلال تھیں وہ رمضان میں حرام کردی گئیں تو جو چیزیں ابدی حرام ہیں وہ انسان کیسے کرسکتا ہے اور انسان کے لئے کیسے جائز اور حلال ہوسکتی ہیں۔

②......صبر کی مشق

اگر کھانے پینے کے لئے دل للچائے تو صبر کرو۔ دل للچانے پر کوئی مواخذہ نہیں۔ دیکھئے رب کریم کا کتنا بڑا اکرم ہے، کیسی رحمت ہے۔ اس نفس کو لگام دینے اور اسے قابو میں لانے کے لئے صبر کی مشق کروائی جاتی ہے۔ جب صبر کی مشق ہوگی، تو کسی بھی گناہ کے تقاضے کے وقت یہ مشق کام دے گی۔ اور اسی طرح اعتکاف کی صورت میں صبر کی مزید مشق ہوتی ہے، اس لئے کہ دنیا بھر سے تعلقات منقطع کر کے بس ایک ہی مالک کے در پر دھرنا مار کر بیٹھا ہوا ہے۔

③......نماز

رمضان میں عام دنوں کی بہ نسبت نماز کی مقدار زیادہ رکھی گئی ہے۔ نماز بھی گناہوں کے مٹانے میں مدد کرتی ہے۔

④......تلاوت

رمضان میں کثرت سے تلاوت کی جاتی ہے۔ نمازوں میں تلاوت، تراویح میں تلاوت، اس کے علاوہ ہر عام سے عام مسلمان بھی ماہِ مبارک میں تلاوت کا خاص اہتمام کرتا ہے اور تلاوت سے اللہ کی محبت میں ترقی ہوتی ہے۔

⑤......نقلِ محبت

رمضان میں مرغوب چیزوں کو چھوڑ دینا، چند گھنٹے ان سے صبر کر لینا اہل محبت کی نقل ہے، عاشقوں کی سی صورت ہے، عاشق اپنے معشوق کے سوا ہر چیز کو بھول جاتا ہے۔

⑥......کوشش اور دعا

جس طرح دنیا کا کوئی کام کوشش کے بغیر نہیں ہوتا اسی طرح عمر بھر کے گناہ بھی بغیر کوشش کے نہیں چھوٹ سکتے۔ سو گناہ چھوڑنے کے لئے پہلی چیز کوشش ہے اور دوسرے نمبر پر دعاء کا اہتمام:

اس طرح دعا کرے کہ:

’’یا اللہ میں گناہ چھوڑنا چاہتا ہوں، تیرا بندہ بننا چاہتا ہوں، مگر نفس و شیطان میری راہ میں رکاوٹ ہیں، یہ مجھے جہنم میں دھکیلنا چاہتے ہیں، تو ہی میری دستگیری فرما، مجھے گناہوں سے بچا، نفس و شیطان کی دست برد سے مجھے چھڑا۔‘‘

اسی طرح دعاء کے ساتھ کوشش بھی جاری رکھے تو ان شاء اللہ تعالیٰ کی مدد پہنچ جائے گی، دعا میں بھی اثر پیدا ہوگا۔ ایک دو دن یہ کام کر کے بیٹھ نہ جائیں، بلکہ مہینہ بھر نفس سے کشتی جاری رکھنی ہے۔

⑦......جسمانی ضعف

روزہ رکھنے سے روزہ دار کو ضعف محسوس ہوتا ہے، یہ ضعف و اضمحلال بھی گناہ چھڑانے کا ایک مستقل نسخہ ہے۔ کمزوری پیدا ہونے سے نفس کی شوخی ختم ہو جاتی ہے نافرمانی کا جذبہ سرد پڑ جاتا ہے۔

⑧......شیاطین کا مقید ہونا

گیارہ ماہ تک شیطان کے کارندے ہمارے نفس میں سرایت کرتے اور مسلسل

اپنا زہر چھوڑتے رہے، پورے گھر میں بیچارہ ایک فرد مسلمان بننا چاہتا ہے۔ گناہوں سے اپنا دامن بچانا چاہتا ہے، مگر شیطان اور اس کے کارندوں میں گھرا ہوا ہے۔ شوہر، بیوی، والدین، بھائی، بہن اور مختلف زاد بہکانے پر تلے ہوئے ہیں۔ اور شیطان سے بھی بڑا کردار ادا کر رہے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی یوں دستگیری فرمائی کہ رمضان میں اسے قید کر دیا جس سے اس کے کارندوں کا کافی حد تک اثر ٹوٹ گیا۔

⑨.....موت کی یاد

اس بات کو سوچیں کہ جس طرح آپ کے بہت سے اعزہ و احباب جو گزشتہ رمضان میں آپ کے ساتھ تھے، اس رمضان میں موجود نہیں۔ اسی طرح ہوسکتا ہے کہ آپ کا بھی یہ آخری رمضان ہو۔ جب موت کو یاد کریں گے تو غفلت جاتی رہے گی۔ دنیا سے دل ٹوٹے گا، آخرت سے جڑے گا اور گناہ چھوٹنے لگیں گے۔

⑩.....عقلی تربیت

رمضان میں دن کو کھانا پینا حرام، مگر رات میں جائز۔ ایسا کیوں؟

یہ سب تربیت ہو رہی ہے، بات سمجھ میں آئے یا نہ آئے مگر اللہ کا حکم آنکھ بند کر کے ماننا پڑے گا، چون و چرا کی گنجائش نہیں۔ مالک کے حکم میں حکمتیں تلاش کرنا بندے کا کام نہیں، اس کا کام تو یہ ہے کہ حکم سنتے ہی کہہ دے کہ اے میرے رب! تیرے حکم پر دل و جان سے راضی ہوں، تیری رضا پر اپنی رضا کو قربان کرتا ہوں۔ میں تیرا بندہ ہوں، تیرے حکم کی سرتابی کی کیا مجال؟

اس ماہ مبارک میں روزہ رکھنے کی برکت سے اگر اصلاحِ کی یہ دولت مل جائے، تو بڑے سے بڑے گناہ بھی چھوٹ جائیں گے اور دل میں اللہ کی محبت پیدا بھی ہوجائے گی۔

(ماخوذ: از وعظ محبت الٰہیہ، مفتی رشید احمد صاحب)

زکوٰۃ

اللہ تعالیٰ نے مالدار لوگوں پر غریبوں کی اعانت کے لئے نقدی مال (سونا، چاندی، روپیہ وغیرہ) میں سے چالیسواں حصہ زکوٰۃ کے نام سے ان پر فرض کیا ہے۔ قرآن شریف میں اکثر نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا حکم ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں سے جنگ کی جنہوں نے بیت المال کو زکوٰۃ دینے سے انکار کیا تھا۔ زکوٰۃ سونا چاندی، سامانِ تجارت اور نقد رقم پر واجب ہے۔ کچھ نام کے مسلمان زکوٰۃ سے یوں جان چھڑاتے ہیں کہ نہ نوٹوں پر زکوٰۃ واجب کہتے ہیں، نہ مالِ تجارت پر۔ سونا و چاندی پر بھی صرف اس صورت میں کہتے ہیں کہ وہ مہر لگا سکہ ہو۔ آج کل وہ نظام ختم ہے اور اس کے عوض نوٹ آ گئے ہیں۔

اہلِ اسلام کے نزدیک زکوٰۃ مال کی تمام اقسام پر ہے۔ سونے کا نصاب ساڑھے سات تولے۔ چاندی کا ساڑھے باون تولے ہے، خواہ نقد ہو یا اس قیمت کا سامانِ تجارت ہو۔ اور اس پر سال گزر جائے۔ رہائشی مکان، فرنیچر، استعمال کے کپڑے، سواری اور دودھ کے مویشی جانور ضروریاتِ زندگی میں شامل ہیں، ان پر زکوٰۃ نہیں ہے، جو لوگ زکوٰۃ نہیں دیتے، قیامت کے دن ان کا مال وزر گنجا سانپ بن کر ان کے گلے کا ہار ہوگا اور انہیں ڈسے گا۔ سونا اور چاندی دوزخ کی آگ میں گرم کر کے اس سے ان کی پیشانی، پہلو اور پیٹھ داغی جائے گی۔

(ماخوذ۔ مسلمان کسے کہتے ہیں؟ مصنف۔ مولانا حافظ مہر محمد)

فضائلِ زکوٰۃ

زکوٰۃ کی تاکید میں چند آیات

﴿وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ ۝﴾

(سورۂ بقرہ: ع۵)

ترجمہ: ''اور قائم کرو نماز اوردو زکوٰۃ اور عاجزی کرو عاجزی کرنے والوں کے ساتھ (یارکوع کرورکوع کرنے والوں کے ساتھ۔''

﴿وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ فَسَاَکْتُبُھَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَالَّذِیْنَ ھُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ ۝﴾ (الاعراف: ع۱۹)

ترجمہ: ''اور میری رحمت (ایسی عام ہے کہ) تمام چیزوں کو محیط ہے، پس میں اس کو ان لوگوں کے لئے لکھوں گا جو خدا تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں۔''

زکوٰۃ کی تاکید میں چند احادیث

﴿عَنْ جَابِرٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ قَالَ رَجُلٌ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَرَاَیْتَ اِنْ اَدَّی الرَّجُلُ زَکٰوۃَ مَالِہٖ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ اَدّٰی زَکٰوۃَ مَالِہٖ فَقَدْ ذَھَبَ عَنْہُ شَرُّہٗ﴾ (رواہ الطبرانی فی الاوسط ابن خزیمۃ فی صحیحہ والحاکم مختصراوقال صحیح علی شرط مسلم کذافی الترغیب)

ترجمہ: ''حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص مال کی زکوٰۃ ادا کر دے، تو اس

مال کا شر اس آدمی سے جاتا رہتا ہے۔"

﴿عَنِ الْحَسَنِ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَصِّنُوْا اَمْوَالَكُمْ بِالزَّكٰوةِ وَدَاوُوْا مَرْضَاكُمْ بِالصَّدَقَةِ وَاسْتَقْبِلُوْا اَمْوَاجَ الْبَلَاءِ بِالدُّعَاءِ وَالتَّضَرُّعِ﴾ (رواہ ابوداؤد فی المراسل ورواہ الطبرانی والبیہقی وغیرہما عن جماعۃ من الصحابۃ مرفوعاً متصلا والمرسل اشبہہ کذا فی الترغیب)

ترجمہ: "حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ راوی ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اپنے مالوں کو زکوٰۃ کے ذریعہ محفوظ بناؤ اور اپنے بیماروں کا صدقہ سے علاج کرو، اور بلا اور مصیبت کی موجوں کا دُعا سے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی سے استقبال کرو۔"

زکوٰۃ ادا نہ کرنے کی وعید میں چند احادیث

﴿عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ صَاحِبِ ذَهَبٍ وَلَا فِضَّةٍ لَا يُؤَدِّیْ مِنْهَا حَقَّهَا اِلَّا اِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ صُفِحَتْ لَهٗ صَفَائِحُ مِنْ نَارٍ فَاُحْمِیَ عَلَيْهَا فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ فَيُكْوٰی بِهَا جَنْبُهٗ وَجَبِيْنُهٗ وَظَهْرُهٗ كُلَّمَا رُدَّتْ اُعِيْدَتْ لَهٗ فِیْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ حَتّٰی يُقْضٰی بَيْنَ الْعِبَادِ فَيَرٰی سَبِيْلَهٗ اِمَّا اِلَی الْجَنَّةِ وَاِمَّا اِلَی النَّارِ﴾

(الحدیث بطولہ فی المشکوٰۃ عن مسلم)

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ راوی ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کوئی شخص جو سونے یا چاندی کا مالک ہو، اور اس کا حق (یعنی زکوٰۃ) ادا نہ کرے تو قیامت کے دن اس سونے چاندی کے پتّرے بنائے جائیں گے اور ان کو جہنم کی آگ میں ایسا تپایا

جائے گا گویا کہ وہ خود آگ کے پترے ہیں، پھر اُن سے اس شخص کا پہلو اور پیشانی اور کمر داغ دی جائے گی اور بار بار اسی طرح تپا تپا کر داغ دئے جاتے رہیں گے قیامت کے پورے دن میں جس کی مقدار دُنیا کے حساب سے پچاس ہزار برس ہوگی۔ اس کے بعد اس کو جہاں جانا ہوگا جنت میں یا جہنم میں چلا جائے گا۔''

﴿عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اٰتَاهُ اللّٰهُ مَالًا فَلَمْ یُؤَدِّ زَکٰوتَهٗ مُثِّلَ لَهٗ مَالُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ شُجَاعًا اَقْرَعَ لَهٗ زَبِیْبَتَانِ یُطَوَّقُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ثُمَّ یَاْخُذُ بِلِهْزِمَتَیْهِ یَعْنِیْ شِدْقَیْهِ ثُمَّ یَقُوْلُ اَنَا مَالُكَ اَنَا کَنْزُكَ ثُمَّ تَلَا وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ الایة﴾ (رواہ البخاری کذا فی المشکوٰۃ وقد روی من مسند ثوبان وابن مسعود وابن عمر بمعناہ فی الترغیب)

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ راوی ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس شخص کو اللہ جل شانہٗ نے مال دیا ہو اور وہ اس کی زکوٰۃ ادا نہ کرتا ہو تو وہ مال قیامت کے دن ایک ایسا سانپ بنا دیا جائے گا جو گنجا ہوگا اور اس کی آنکھوں پر دو سیاہ نقطے ہوں گے پھر وہ سانپ اس کی گردن میں طوق کی طرح ڈالدیا جائے گا، جو اس کے دونوں جبڑوں کو پکڑ لے گا اور کہے گا، میں تیرا مال ہوں، تیرا خزانہ ہوں۔ اس کے بعد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے (اس کی تائید میں یہ آیت) ''وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ الایة'' پڑھی۔'' (ماخوذ از فضائل زکوٰۃ)

حج

اسلام کا پانچواں رکن حجِ بیت اللہ ہے، جس کا منکر کافر ہے، تارک فاسق ہے۔ ''جو مالدار صاحبِ استطاعت ہے اور حج نہیں کرتا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ وہ خواہ یہودی ہو کر مرے یا عیسائی ہو کر مرے مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے۔''

آج کل دولت کی بہتات ہے اور وسائل سفر فراواں ہیں، اگر کسی نے حج کی تمنا نہیں کی اور نہ کوئی کوشش کی ہے تو اس کے اسلام و ایمان پر از حد افسوس ہے۔

فرمانِ نبوی ہے: جس نے پاک مال سے حج کیا اور گناہ بھی (دوران حج) نہ کیا۔ تو وہ حج کر کے واپس یوں ہوگا، گویا اس کو آج ماں نے (بے گناہ) جنا ہے۔

حج اللہ تعالیٰ سے خصوصی ملاقات کا سنہری موقع ہے کہ حاجی اس کے گھر میں وفد اور مہمان بن کر جاتے ہیں۔ خدا کا فرمان ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ ﴾

تَرجَمہ: ''ایمان والے سب سے زیادہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔''

بن دیکھے محبوب سے یہ محبت اور وصال کی تڑپ، عاشق صادق کو مجبور کر دیتی ہے کہ وہ اس کے مرکزِ جمال و تجلیات میں حاضری دے اور عشق سے مضطرب قلب کو قرار و سکون پہنچا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ احرام کا یونیفارم، تلبیہ کی صدائیں اور ترکِ زینت کی پابندیاں، عاشقانہ اداؤں کو اجاگر کرتی ہیں اور رب العٰلمین کے ہیبت و جلال کے مظہر بیت اللہ پر نگاہ ڈالتے ہی ان کی حالت غیر ہو جاتی ہے اور کئی تاب نہ لا کر واصلِ بحق ہو جاتے ہیں۔

حج اس مسلمان پر فرض ہے جو قرض اور ضروریاتِ زندگی سے زائد اتنا مال رکھتا ہو کہ سفر خرچ اور تا واپسی اہل و عیال کا بندوبست کر سکے۔ راستہ پر امن ہو شخص تندرست ہو۔ اندھا، لنگڑا اور معذور نہ ہو، عورت عازم حج ہو تو اس کے ساتھ محرم کا ہونا شرط ہے۔ بلا عذرِ شرعی کوئی حج میں تاخیر کرے گا تو گنہگار ہوگا۔

حج کی ترغیب میں چند آیات

﴿وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰی كُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ ۙ لِّیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ﴾ (الحج:۲۷)

ترجمہ: ''لوگوں میں حج (کے فرض ہونے) کا اعلان کر دو (اس اعلان سے) لوگ تمہارے پاس (یعنی تمہاری اس عمارت کے پاس حج کے لئے) چلے آئیں گے، پاؤں چل کر بھی اور ایسی اونٹنیوں پر (سوار ہو کر) بھی دور دراز رستوں سے چل کر آئی ہوں (اور سفر کی وجہ سے) دبلی ہو گئی ہوں۔ تاکہ یہ آنے والے اپنے منافع حاصل کریں۔''

﴿اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ﴾ (المائدہ:۳)

ترجمہ: ''آج کے دن تمہارے لئے تمہارے دین کو میں نے (ہر طرح) کامل و مکمل بنا دیا اور تم پر اپنا انعام (آج) پورا کر دیا اور میں نے اسلام کو تمہارا دین بننے کے لئے (ہمیشہ کو) پسند کر لیا (کہ قیامت تک تمہارا یہی دین رہے گا۔ اس کو منسوخ کر کے دوسرا دین تجویز نہ کیا جائے گا)۔''

حج کی ترغیب میں چند احادیث

﴿عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ حَجَّ لِلّٰهِ فَلَمْ یَرْفُثْ وَلَمْ یَفْسُقْ رَجَعَ كَیَوْمٍ وَلَدَتْهُ اُمُّهٗ﴾ (مشکوۃ)

ترجمہ: ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص اللہ کے لئے حج کرے اس طرح کہ اس حج میں نہ "رَفَثْ" (فحش بات) ہو اور نہ فسق (حکم عدولی) ہو وہ حج سے اس طرح (پاک صاف ہو کر) واپس ہوتا ہے، جیسا اس دن تھا جس دن اس کی ماں نے اس کو جنا تھا۔''

﴿عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا مِنْ يَوْمٍ اَكْثَرُ مِنْ اَنْ يُّعْتِقَ اللّٰهُ فِيْهِ عَبْدًا مِّنَ النَّارِ مِنْ يَوْمِ عَرَفَةَ وَاِنَّهٗ لَيَدْنُوْ ثُمَّ يُبَاهِيْ بِهِمُ الْمَلٰئِكَةَ فَيَقُوْلُ مَا اَرَادَ هٰؤُلَآءِ﴾ (رواہ مسلم)

ترجمہ: ''حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں جس میں اللہ تعالیٰ عرفہ کے دن سے زائد بندوں کو جہنم سے نجات دیتے ہوں۔ یعنی لوگوں کی جتنی کثیر تعداد کی عرفہ کے دن خلاصی ہوتی ہے، اتنی کثیر تعداد میں کسی اور دن نہیں ہوتی۔ حق تعالیٰ شانہٗ (دنیا کے) قریب ہوتے ہیں، پھر ان بندوں کے ذریعہ اللہ پاک فرشتوں سے فخر کرتے ہیں، اللہ پاک فرماتے ہیں، یہ بندے کیا چاہتے ہیں؟''

حج کی حقیقت

حج درحقیقت دو مناظر کا نمونہ ہے اور اس کی ہر چیز میں دو حقیقتیں پنہاں ہیں۔ اگرچہ اللہ جل شانہٗ کے ہر حکم میں لاکھوں مصلحتیں اور حکمتیں ایسی ہیں کہ جن تک ہر شخص کے خیال کی رسائی نہیں ہوسکتی، لیکن بعض مصالح ایسی کھلی ہوئی اور ظاہر ہوتی ہیں جو ہر شخص کے ذہن میں آجاتی ہیں۔

اسی طرح حج کے ہر ہر رکن میں بہت سی مصالح تو ایسی ہیں جن تک ذہن کی رسائی بھی نہیں، لیکن یہ دو چیزیں اس کے ہر ہر رکن اور ہر ہر جز میں بالکل عیاں ہیں۔

۱ ......ایک یہ کہ حج نمونہ ہے موت اور مرنے کے بعد کے حالات کا۔

۲ ......دوسرا نمونہ ہے عشق اور محبت کے اظہار اور روح کو حقیقی عشق اور حقیقی محبت سے رنگنے کا۔

نمونہ کے طور پر دونوں مناظر کی مختصر تشریح کی جاتی ہے۔

۱ ......حج میں پہلا نمونہ موت اور اس کے بعد کے منظر کا ہے کہ آدمی حج کے لئے جس وقت گھر سے چلتا اور سب عزیز واقارب، گھربار، وطن اور دوست احباب کو چھوڑ کر دوسرے ملک جاتا ہے، یہ ایسے ہی ہے جیسے گویا دوسرے...... عالم کا سفر اختیار کر رہا ہے۔ جن چیزوں کے ساتھ دل مشغول تھا۔ مثلاً گھربار کھیتی، باغ، دوست احباب کی مجلسیں سب ہی اس وقت چھوٹ رہی ہیں، ایسے ہی مرنے کے وقت سب کو خیر باد کہنا پڑتا ہے، حج کی روانگی کے وقت یہ چیز قابلِ غور وفکر اور قابلِ عبرت ہونی چاہئے کہ جیسا آج عارضی مدت کے لئے یہ سب کچھ چھوٹ رہا ہے، بہت جلد وہ وقت بھی آنے والا ہے کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یہ سب چیزیں چھوٹنے والی ہیں۔

اس کے بعد سواری پر سوار ہونا، اگر عبرت اور غور کی نگاہ سے دیکھا جائے تو جنازہ پر سوار ہو کر چل دینے کی یاد تازہ کرتا ہے۔ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد جس طرح وہ ہر ہر قدم پر وطن اور احباب سے دوری اور جدائی بڑھاتی ہے، ٹھیک اسی طرح جنازہ اٹھانے والے بھی ہر ہر قدم پر سب اعزہ اقرباء گھربار اور ساز وسامان سے دور لے جاتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح کچھ لوگ ضرور جنازہ کی نماز تک ساتھ دیتے ہیں اور کچھ قبر تک بھی پہنچا دیتے ہیں اور کچھ قبر میں رکھنے اور مٹی ڈالنے تک بھی ساتھ دیتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح یہ سارے مناظر حاجی کے ساتھ بھی پیش آتے ہیں کہ کچھ لوگ گھر ہی سے مصافحہ کر کے فی امان اللہ کہہ دیتے ہیں، کچھ اسٹیشن تک تکلیف فرما لیتے ہیں اور کچھ بہت ہی خاص ہوتے ہیں جو جہاز تک پہنچا دیتے ہیں۔

جہاز (اور قبر) میں جانے والے صرف وہی رفیق اور ساتھی ہوتے ہیں جو اس

عالم تک ساتھ دینے والے ہوں، چاہے وہ عزیز واقارب ہوں یا مال ومتاع ہو۔ ان ساتھ جانے والوں میں بعض رفیقِ سفر ایسے مخلص، غمگسار، راحت رساں ہوتے ہیں جو ہر ہر قدم پر راحت پہنچاتے ہیں اور بعض رفیق ایسے بدخلق، کج مزاج ضِدی، جھگڑالو ہوتے ہیں جو سفر کی ہر ہر منزل میں بجائے راحت وآرام پہنچانے کے الٹا مصیبت کا سب بنتے ہیں۔

بعینہٖ یہی ساری صورت حال آخرت کے سفر میں پیش آئے گی کہ قبر میں ساتھ جانے والے صرف بندے کے اعمال ہی ہوں گے جو آخر تک ساتھ رہنے والے ہیں۔

پھر ان اعمال میں اعمالِ حسنہ ہر قسم کی راحت اور آرام کا سبب بنیں گے اور اعمالِ سیئہ ہر قسم کی اذیت اور تکلیف کا سبب بنیں گے۔ اعمالِ حسنہ نہایت حسین و جمیل آدمی کی صورت میں قبر میں ساتھ رہیں گے، اور اعمالِ سیئہ نہایت قبیح، ڈراؤنی، گندی اور بدبودار صورت میں۔

عالمِ آخرت میں جتنی راحت پہنچتی ہے، وہ صرف بظاہر اپنے ان نیک اعمال سے پہنچتی ہے جو مرنے سے پہلے کر لئے ہوں جیسا کہ سفر حج میں جتنی راحت پہنچتی ہے وہ صرف اس مال وزر اور سامان سے پہنچتی ہے جو سفر سے پہلے مہیا کر لیا ہو۔

کسی خوش قسمت کے لئے کوئی عزیز قریب یا دوست کچھ پڑھ کر یا صدقہ و خیرات کر کے کچھ ایصالِ ثواب کر دے تو مرنے کے بعد بھی مرنے والے کے کام آجاتا ہے، جیسا کہ حاجی کے پاس کوئی اس کا عزیز یا دوست کوئی روپیہ پیسہ بھیج دے تو اس سفر میں حاجی کے لئے مسرت، خوشی اور راحت کا سبب بنتا ہے!

اس کے بعد سفر کے درمیان میں جتنے خطرات ہیں مثلاً ڈاکو، چور، سخت مزاج حاکموں کی طرف سے سامان کی تفتیش حالات کی تحقیق، پاسپورٹ وغیرہ جانچ پڑتال جیسے جتنے مناظر حاجی کو بھگتنا پڑتے ہیں وہ قبر کے سارے مناظر کی یاد دلاتے ہیں کہ

منکر نکیر کا سوال بھی ہوگا، اپنے ایمان کا امتحان بھی ہوگا، اور سانپ بچھو وغیرہ کیڑے مکوڑے بھی قبر میں طرح طرح سے ستائیں گے۔ اعمال نامہ بھی اپنے ساتھ ہی ہوگا۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: "وَ کُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ ط الاٰیة"

(بنی اسرائیل: ۱۳)

ہاں خوش قسمت لوگ جن کے کاغذات درست ہوتے ہیں، وہ معمولی سی تفتیش اور پاسپورٹ وغیرہ کے بعد چند گھنٹوں میں جہاز تک پہنچ جاتے ہیں، اسی طرح جن کے پاس نیک اعمال کا ذخیرہ ہوگا وہ قبر کے ان سارے احوال سے بے خبر اور بے فکر دلہنوں کی طرح اس میں ایسے آرام فرمائیں گے کہ قیامت تک کا سارا طویل زمانہ ان کے لئے گھنٹوں اور منٹوں میں گزر جائے گا، جیسا کہ نئی دلہن پہلی شب میں مخمل کے بستروں پر سوتی ہے۔

اس کے بعد احرام کی دو سفید چادریں ہر وقت کفن کی چادروں کی یاد دلاتی ہیں۔ اگر اللہ پاک توفیق دے تو جتنے دن احرام بندھا رہے، ہر وقت اسی کفن کی دو چادروں میں لپٹے رہنا یاد رہنا چاہئے۔

احرام کے وقت "لَبَّیْکَ" (حاضر ہوں حاضر ہوں) قیامت میں پکارنے والے کی آواز پر دوڑ پڑنے کی یاد دلاتی ہے۔ قرآن کریم میں ہے: "یَوْمَئِذٍ یَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِیَ لَا عِوَجَ لَهٗ" (طٰہٰ: ۱۰۸) "اس دن سب کے سب (خدا کی طرف سے) پکارنے والے (یعنی صور پھونکنے والے فرشتہ) کی اتباع کریں گے۔" اور دوسری جگہ ارشاد ہے: "وَتَرٰی کُلَّ اُمَّةٍ جَاثِیَةٍ کُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰی اِلٰی کِتٰبِهَا" (جاثیہ: ۲۸) "تو دیکھے گا ہر امت کو زانو پر گری ہوئی اور ہر اُمت پکاری جائے گی اپنی کتاب کی طرف۔"

مکہ مکرمہ میں داخل ہونا گویا اس عالم میں داخل ہو جانا ہے جس میں اللہ کی رحمت کی امید ہے کہ مکہ دارالامن ہے۔ لیکن اپنی بداعمالیوں سے یہ خوف بھی غالب ہے کہ امن کی جگہ پر بھی امن نہ ملے، مکہ کا سارا قیام اسی امید اور خوف میں گزرنا

چاہئے کہ اس جگہ کا امن کی جگہ ہونا اللہ کی رحمت ومغفرت، کرم ولطف اور انعام و احسان کی وجہ سے ہے، اور اپنی بداعمالیاں جو ساری عمر کی ہیں، وہ یاد آکر ''مر کے بھی چین نہ آیا تو کدھر جائیں گے'' کی فکر میں گزرنا چاہئے۔

بیت اللہ پر نظر پڑنا قیامت میں گھر کے مالک کے دیدار کو یاد دلاتا ہے اور جس قدر خوف اور ہیبت، عظمت اور جلال کا وہ مظہر ہے، وہی سارے آداب اس وقت ہونا چاہئیں جیسا کہ کسی بڑے بادشاہ کے دربار میں حاضری کے وقت ہوتے ہیں۔ اسی بیت اللہ کا طواف ان فرشتوں کی یاد تازہ کرتا ہے جو عرشِ معلیٰ کا طواف کرتے رہتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔

اسی کعبہ کے پردوں سے لپٹ کر رونا اور ملتزم کو چمٹنا اس قصوروار کی مثال ہے جو کسی محسن ومربی کا بڑا قصور کر کے اس کا دامن پکڑ کر معافی مانگتا ہے اور اس کے گھر کے در و دیوار کو پکڑ کر روتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ قصور کی معافی کے یہی راستے ہیں۔

صفا و مروہ کے درمیان دوڑنا میدانِ حشر میں اِدھر اُدھر دوڑنے کی یاد تازہ کرتا ہے۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے:

﴿يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ﴾ (قمر:۷)

ترجمہ: ''قبروں سے اس طرح نکل رہے ہوں گے گویا وہ ٹڈی دل ہے جو پراگندہ ہے۔''

یہ منظر بندہ کے ناقص خیال میں قیامت کے ایک عجیب منظر کی یاد تازہ کرتا ہے جس کا بڑا مفصل قصہ احادیث میں آتا ہے۔ کہ حشر کے دن جب مخلوق نہایت پریشان حال ہوگی اور مصائب کی کثرت سے تنگ ہو کر یہ سوچے گی کہ انبیاء کرام علیہم السلام بڑی اونچی ہستیاں ہیں اور اللہ کے مقبول بندے ہیں ان سے جا کر سفارش کی درخواست کریں، اس خیال سے سب سے پہلے حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس جا کر عرض کریں گے کہ: آپ ہمارے باپ ہیں اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے ہاتھ

سے پیدا کیا، فرشتوں سے سجدہ کرایا، خود ہر چیز کے نام کی آپ کو تعلیم دی، وغیرہ وغیرہ۔ آپ ہماری سفارش کر دیں، تو وہ فرمائیں گے کہ میں تو نہیں کر سکتا، اگر مجھ سے اس ممنوع دانہ کے کھانے کا سوال ہو گیا تو کیا ہوگا؟ تم حضرت نوح علیہ السلام کے پاس جاؤ۔

یہ لوگ پریشان حال ہو کر حضرت نوح علیہ السلام کے پاس جائیں گے، وہ بھی عذر فرمائیں گے کہ: میں نے طوفان کے زمانہ میں اپنے بیٹے کے بچانے کا بے محل سوال کر لیا تھا، تم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جاؤ، تو وہ بھی عذر فرما کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حوالہ دیں گے، وہ بھی عذر فرما کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا حوالہ دیں گے، وہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جانے کا مشورہ دیں گے۔ اور یہ اعزاز حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے لئے ہے کہ اس جلال کے دن میں سفارش کی ابتدا فرما دیں گے۔ مختصراً یہاں صرف یہی منظر سامنے لانا ہے کہ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر مارے مارے پریشان حال ہو کر ایک دن پھرنا ہے۔ جو بڑا سخت دن ہوگا۔

عرفات کا میدان تو حشر کے میدان کا پورا نمونہ ہے ہی کہ آفتاب کی تمازت اور سب کا ایک لق و دق میدان میں ایسی حالت میں اجتماع کہ مغفرت کی امید بھی ہے اور گناہوں کا خوف بھی۔ بندہ کے ناقص خیال میں عرفات کے میدان میں بڑی غور و فکر کی جو چیز ہے وہ اس عہد و میثاق کی یاد ہے جو ازل میں "اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ" کے الفاظ سے لیا گیا تھا کہ عالم ارواح میں حق سبحانہٗ و تقدس نے ساری ارواح سے یہ سوال کیا تھا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے بیک زبان ہو کر کہا تھا کہ بے شک آپ ہمارے رب ہیں۔

مشکوٰۃ شریف میں بروایت مسند احمد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ یہ عہد عرفات ہی کے میدان میں ہوا تھا۔ یہ وقت اور یہ جگہ اس بات کی یاد دلاتی ہے کہ ہم نے کیا عہد کیا تھا اور اس عہد کو کس طرح پورا کیا؟

اس کے بعد مزدلفہ منیٰ وغیرہ کے اجتماعات ہیں۔

امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان مواقع میں لوگوں کا اژدہام اور ان کا شور وشغب، مختلف زبانیں، مختلف آوازیں اور لوگوں کا اپنے اپنے اماموں کے پیچھے چلنا، قیامت کے میدان میں اپنے اپنے انبیاء اور مقتداؤں کے پیچھے چلنے اور حیرانی و پریشانی کے عالم میں کبھی یہاں اور کبھی وہاں جانے کی یاد تازہ کرتا ہے، ان مواقع میں عاجزی اور انکساری کا اہتمام کرنا کام آنے والی چیز ہے۔

یہ مختصر خاکہ ہے حج کے اس منظر کا جو قیامت کی یاد کو تازہ کرتا ہے، جس کو مختصر الفاظ اور مختصر احوال کے ساتھ اشارات کے طرز پر لکھا گیا ہے۔ غور کیا جائے تو اِس نمونہ سے بہت سی تفصیلات سمجھ میں آسکتی ہیں۔

❷ ..... دوسرا منظر اظہارِ عشق ومحبت کا ہے جو حاجی کے حال سے ایسا ظاہر اور واضح ہے کہ اس کے لئے کسی تفصیل کی حاجت نہیں۔

بندوں کا تعلق حق تعالیٰ و تقدس کے ساتھ دو طرح کا ہے۔ ایک نیاز مندی اور بندگی کا کہ وہ پاک ذات مالک ہے، خالق ہے، اس تعلق کا مظہر نماز ہے جو سراسر نیاز و اظہارِ عبدیت ہے، اسی لئے اس میں ساری چیزیں اسی تعلق کا مظہر ہیں کہ وضو اور پاک کپڑوں کے ساتھ نہایت وقار اور سکون کے ساتھ، موزوں لباس اور شاہی آداب کے ساتھ دربار کی حاضری ہے، وقار اور سکون سے اول کانوں پر ہاتھ رکھ کر عبدیت اور اللہ جل جلالہٗ کی بڑائی کا اقرار کرنا ہوتا ہے، پھر ہاتھ باندھ کر معروضہ پیش کیا جاتا ہے، سر جھکا کر تعظیم کی جاتی ہے، اور پھر زمین پر پیشانی رگڑ کر اپنی نیاز مندی اور عجز کا اظہار کیا جاتا ہے۔

اس نماز میں سکون و وقار کی جتنی پابندی کی جائے گی اتنا خشوع اور خضوع بڑھے گا۔ نماز کے لئے بھاگ کر چلنا مکروہ ہے، نماز کے انتظار میں بیٹھے ہوئے بھی انگلیوں میں انگلیاں ڈال کر بیٹھنا مکروہ ہے، نماز میں انگلیاں چٹخانا مکروہ ہے، بے

ضرورت کھانسنا مکروہ ہے، حتی کہ ادھر ادھر نظر کرنا بھی مکروہ ہے، بے ترتیب یعنی ناموزوں ہیئت سے کپڑا پہننا مکروہ ہے، ایسے ہی بدن پر کپڑا لٹکانا مکروہ ہے۔ نماز میں بات کرنے سے نماز ضائع ہو جاتی ہے، وضو ٹوٹ جانے سے نماز جاتی رہتی ہے، حتیٰ کہ بے اختیار اور بے ارادہ ہنس پڑنے سے بھی نماز ضائع ہو جاتی ہے، سجدہ میں دونوں پاؤں زمین سے اٹھ جانے سے ضائع ہو جاتی ہے، اس لئے کہ یہ بھی سکون اور وقار کے خلاف ہے۔

حق تعالیٰ وتقدس کے ساتھ دوسرا تعلق محبت اور عشق کا ہے کہ وہ مُربی ہے، منعم ہے، محسن ہے، اور جمال و کمال کے جتنے اوصاف ہو سکتے ہیں ان سب کے ساتھ متصف ہے۔

جب عشق کے طفیل یہ مبارک سفر ہے تو راستہ کی سب مشقتیں اسی ذوق اور جذبہ کے تحت ہونا ضروری ہیں اور اسی فریفتگی سے ان کو برداشت کرنا چاہئے۔

اس کے بعد احرام بھی اسی عاشقانہ رنگ کا پورا مظہر ہے کہ نہ سر پر ٹوپی، نہ بدن پر کرتا، فقیرانہ صورت، نہ خوشبو نہ زینت، ایک مجنونانہ ہیئت، جو کرب و بے چینی کے کمال کو ظاہر کرتی ہے، کبھی محبوب کے گھر کے چکر کاٹتا ہے، کبھی اس کے در و دیوار اور چوکھٹ کو چومتا ہے، آنکھیں ملتا ہے، پیشانی اور سر رگڑتا ہے۔

اس کے بعد صفا مروہ کے درمیان دوڑنا بھی اسی مجنونانہ انداز کا ایک پر کیف منظر ہے کہ ننگے سر، نہ کرتہ، نہ پاجامہ، اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر بھاگے بھاگے پھر رہے ہیں۔

اس کے بعد منیٰ میں شیاطین کے پتھر مارنا اس جنون و وحشت کے آخری حصہ کا نظارہ ہے جو عشاق کو پیش آتا ہے، عاشق کا جنون جب حد سے تجاوز کرتا ہے تو وہ ہر اس شخص کے پتھر مارا کرتا ہے جس کو وہ اپنے کام میں مخل سمجھتا ہے۔

شیخ المشائخ قطبِ دوراں علامہ شبلی قدس سرہ کے ایک مُرید حج کر کے آئے، تو

شیخ نے ان سے سوالات فرمائے۔

۱ ..... وہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے شیخ نے دریافت فرمایا کہ: تم نے حج کا ارادہ اور عزم کیا تھا؟ میں نے عرض کیا کہ جی حج کا پختہ قصد کیا تھا، آپ نے فرمایا کہ اس کے ساتھ ان تمام ارادوں کو ایک دم چھوڑنے کا عہد کر لیا تھا جو پیدا ہونے کے بعد سے آج تک حج کی شان کے خلاف کئے؟ میں نے کہا یہ عہد تو نہیں کیا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ پھر حج کا عہد ہی نہیں کیا۔

۲ ..... پھر شیخ نے فرمایا کہ احرام کے وقت بدن کے کپڑے نکال دیئے تھے؟ میں نے عرض کیا جی بالکل نکال دیئے تھے۔ آپ نے فرمایا: اس وقت اللہ کے سوا ہر چیز کو اپنے سے جدا کر دیا تھا؟ میں نے عرض کیا ایسا تو نہیں ہوا۔ آپ نے فرمایا تو پھر کپڑے ہی کیا نکالے۔

۳ ..... آپ نے فرمایا وضو اور غسل سے طہارت حاصل کی تھی؟ میں نے عرض کیا جی ہاں بالکل پاک صاف ہو گیا تھا۔ آپ نے فرمایا اس وقت ہر قسم کی ظاہری و باطنی گندگیوں اور لغزشوں سے پاکی حاصل ہو گئی تھی، میں نے عرض کیا کہ یہ تو نہیں ہوئی تھی۔ آپ نے فرمایا پھر پاکی ہی کیا حاصل ہوئی۔

۴ ..... پھر آپ نے فرمایا لبیک پڑھا تھا؟ میں نے عرض کیا جی ہاں لبیک پڑھا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ جل شانہٗ کی طرف سے لبیک کا جواب ملا تھا؟ میں نے عرض کیا مجھے تو کوئی جواب نہیں ملا۔ تو فرمایا کہ پھر لبیک کیا کہا۔

۵ ..... پھر فرمایا کہ حرمِ محترم میں داخل ہوئے تھے؟ میں نے عرض کیا کہ داخل ہوا تھا، فرمایا اس وقت ہر حرام چیز کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ترک کا عزم کر لیا تھا؟ میں نے کہا یہ تو میں نے نہیں کیا۔ فرمایا کہ پھر حرم میں بھی داخل نہیں ہوئے۔

۶ ..... پھر فرمایا کہ مکہ کی زیارت کی تھی؟ میں نے عرض کیا جی زیارت کی تھی، فرمایا اس وقت دوسرے عالم کی زیارت نصیب ہوئی؟ میں نے عرض کیا اُس عالم کی

تو کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ فرمایا پھر مکہ کی بھی زیارت نہیں ہوئی۔

۷ ..... پھر فرمایا کہ مسجدِ حرام میں داخل ہوئے تھے؟ میں نے عرض کیا کہ داخل ہوا تھا، فرمایا کہ اس وقت حق تعالیٰ شانہٗ کے قرب میں داخلہ محسوس ہوا؟ میں نے عرض کیا کہ مجھے تو محسوس نہیں ہوا۔ فرمایا کہ تب تو مسجد میں بھی داخلہ نہیں ہوا۔

۸ ..... پھر فرمایا کہ کعبہ شریف کی زیارت کی؟ میں نے عرض کیا کہ زیارت کی، فرمایا کہ وہ چیز نظر آئی جس کی وجہ سے کعبہ کا سفر اختیار کیا جاتا ہے، میں نے عرض کیا کہ مجھے تو نظر نہیں آئی، فرمایا پھر تو کعبہ شریف کو نہیں دیکھا۔

۹ ..... پھر فرمایا کہ طواف میں رَمل کیا تھا؟ (خاص طریقہ پر دوڑنے کا نام ہے) میں نے عرض کیا کہ کیا تھا۔ فرمایا کہ اس بھاگنے میں دنیا سے ایسے بھاگے تھے، جس سے تم نے یہ محسوس کیا ہو کہ تم دُنیا سے بالکل یکسو ہو چکے ہو۔ میں نے عرض کیا کہ نہیں محسوس ہوا، فرمایا کہ پھر تم نے رمل بھی نہیں کیا۔

۱۰ ..... پھر فرمایا کہ حجر اسود پر ہاتھ رکھ کر اس کو بوسہ دیا تھا؟ میں نے عرض کیا جی ایسا کیا تھا۔ تو انہوں نے خوف زدہ ہو کر ایک آہ کھینچی اور فرمایا تیرا ناس ہو، خبر بھی ہے کہ جو حجر اسود پر ہاتھ رکھے، وہ گویا اللہ جل شانہٗ سے مصافحہ کرتا ہے اور جس سے حق سبحانہٗ وتقدس مصافحہ کریں، وہ ہر طرح سے امن میں ہو جاتا ہے۔ تو کیا تجھ پر امن کے آثار ظاہر ہوئے؟ میں نے عرض کیا کہ مجھ پر تو امن کے آثار کچھ بھی ظاہر نہیں ہوئے۔ تو فرمایا کہ تو نے حجر اسود پر ہاتھ ہی نہیں رکھا۔

۱۱ ..... پھر فرمایا کہ مقامِ ابراہیم پر کھڑے ہو کر دو رکعت نفل پڑھی تھی؟ میں نے عرض کیا کہ پڑھی تھی، فرمایا کہ اس وقت اللہ جل شانہٗ کے حضور میں ایک بڑے مرتبہ پر پہنچا تھا، کیا اس مرتبہ کا حق ادا کیا؟ اور جس مقصد سے وہاں کھڑا ہوا تھا وہ پورا کر دیا؟ میں نے عرض کیا کہ میں نے تو کچھ نہیں کیا۔ فرمایا کہ تو

نے پھر تو مقامِ ابراہیم علیہ السلام پر نماز ہی نہیں پڑھی۔

۱۲ ..... پھر فرمایا کہ صفا مروہ کے درمیان سعی کے لئے صفا پر چڑھے تھے؟ میں نے عرض کیا چڑھا تھا، فرمایا وہاں کیا کیا؟ میں نے عرض کیا کہ سات مرتبہ تکبیر کہی اور حج کے مقبول ہونے کی دعا کی، فرمایا کیا تمہاری تکبیر کے ساتھ فرشتوں نے بھی تکبیر کہی تھی؟ اور اپنی تکبیر کی حقیقت کا تمہیں احساس ہوا تھا؟ میں نے عرض کیا کہ نہیں۔ فرمایا کہ تم نے تکبیر ہی نہیں کہی۔

۱۳ ..... پھر فرمایا کہ صفا سے نیچے اُترے تھے؟ میں نے عرض کیا کہ اُترا تھا، فرمایا اس وقت ہر قسم کی علت دور ہو کر تم میں صفائی آ گئی تھی؟ میں نے عرض کیا کہ نہیں۔ فرمایا کہ نہ تم صفا پر چڑھے نہ اُترے۔ پھر فرمایا کہ صفا مروہ کے درمیان دوڑے تھے؟ میں نے کہا دوڑا تھا۔ فرمایا کہ اس وقت اللہ کے علاوہ ہر چیز سے بھاگ کر اس کی طرف پہنچ گئے تھے؟ غالباً "فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ" کی طرف اشارہ ہے جو سورۂ شعراء میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں ہے، دوسری جگہ اللہ پاک کا ارشاد ہے "فَفِرُّوْا اِلَى اللّٰهِ" (ذاریات: ۵۰) میں نے عرض کیا کہ نہیں، فرمایا کہ تم دوڑے ہی نہیں۔

۱۴ ..... پھر فرمایا کہ مروہ پر چڑھے تھے میں نے عرض کیا کہ چڑھا تھا۔ فرمایا کہ تم پر وہاں سکینہ نازل ہوا، اور اس سے وافر حصہ حاصل کیا؟ میں نے عرض کیا کہ نہیں۔ فرمایا کہ مروہ پر چڑھے ہی نہیں۔

۱۵ ..... پھر فرمایا کہ منیٰ گئے تھے؟ میں نے عرض کیا گیا تھا۔ فرمایا کہ وہاں اللہ جلِ شانہٗ سے ایسی امیدیں بندھ گئی تھیں۔ جو معاصی کے حال کے ساتھ نہ ہوں، میں نے عرض کیا کہ نہ ہو سکیں، فرمایا کہ منیٰ ہی نہیں گئے۔

۱۶ ..... پھر فرمایا کہ مسجد خیف میں (جو منیٰ میں ہے) داخل ہوئے تھے؟ میں نے عرض کیا کہ داخل ہوا تھا۔ فرمایا کہ اس وقت اللہ جل شانہٗ کے خوف کا اس قدر

غلبہ ہو گیا تھا جو اس وقت کے علاوہ نہ ہوا ہو؟ میں نے عرض کیا کہ نہیں۔ فرمایا کہ مسجدِ خیف میں داخل نہیں ہوئے۔

۱۷ ..... پھر فرمایا کہ عرفات کے میدان میں پہنچے تھے؟ میں نے عرض کیا کہ حاضر ہوا تھا۔ فرمایا کہ وہاں اس چیز کو پہچان لیا تھا۔ کہ دنیا میں کیوں آئے تھے؟ اور کیا کر رہے ہو؟ اور کہاں اب جانا ہے؟، اور ان حالات پر متنبہ کرنے والی چیز کو پہچان لیا تھا؟ میں نے عرض کیا کہ نہیں۔ فرمایا کہ پھر تو عرفات پر بھی نہیں گئے۔

۱۸ ..... پھر فرمایا کہ مزدلفہ گئے تھے؟ میں نے عرض کیا کہ گیا تھا۔ فرمایا کہ وہاں اللہ جل شانہٗ کا ایسا ذکر کیا تھا جو اس کے ماسوا کو دل سے بھلا دے (جس کی طرف قرآن پاک کی آیت "فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ" (بقرہ: ۲۵) میں اشارہ ہے۔ میں نے عرض کیا کہ ایسا تو نہیں ہوا۔ فرمایا کہ پھر تو مزدلفہ پہنچے ہی نہیں۔

۱۹ ..... پھر فرمایا کہ منیٰ میں جا کر قربانی کی تھی؟ میں نے عرض کیا کہ کی تھی۔ فرمایا کہ اس وقت اپنے نفس کو ذبح کر دیا تھا؟ میں نے عرض کیا کہ نہیں، فرمایا کہ پھر تو قربانی ہی نہیں کی۔

۲۰ ..... پھر فرمایا کہ رَمی کی تھی (یعنی شیطانوں کے کنکریاں ماری تھیں؟) میں نے عرض کیا کہ کی تھی، فرمایا کہ ہر کنکری کے ساتھ اپنے سابقہ جہل کو پھینک کر کچھ علم کی زیادتی محسوس ہوئی؟ میں نے عرض کیا کہ نہیں، فرمایا کہ رمی بھی نہیں کی۔

۲۱ ..... پھر فرمایا کہ طوافِ زیارت کیا تھا؟ میں نے عرض کیا کہ کیا تھا۔ فرمایا کہ اس وقت کچھ حقائق منکشف ہوئے تھے؟ اور اللہ جل شانہٗ کی طرف سے تم پر اعزار واکرام کی بارش ہوئی تھی؟ اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حاجی اور عمرہ کرنے والا اللہ کی زیارت کرنے والا ہے۔ اور جس کی زیارت کو

کوئی جائے اس پر حق ہے کہ اپنے زائرین کا اکرام کرے۔ میں نے عرض کیا کہ مجھ پر تو کچھ منکشف نہیں ہوا۔ فرمایا تم نے طوافِ زیارت بھی نہیں کیا۔

۲۲ ..... پھر فرمایا کہ حلال ہوئے تھے (احرام کھولنے کو حلال ہونا کہتے ہیں) میں نے عرض کیا ہوا تھا۔ فرمایا کہ ہمیشہ حلال کمائی کا اس وقت عہد کر لیا تھا؟ میں نے عرض کیا نہیں، فرمایا کہ تم حلال بھی نہیں ہوئے۔

۲۳ ..... پھر فرمایا کہ الوداعی طواف کیا تھا؟ میں نے عرض کیا کہ کیا تھا۔ فرمایا اس وقت اپنے تن من کو "کلیّۃً الوداع" کہہ دیا تھا؟ میں نے عرض کیا نہیں۔ فرمایا کہ تم نے طوافِ وداع بھی نہیں کیا۔

۲۴ ..... پھر فرمایا دوبارہ حج کو جاؤ اور اس طرح حج کر کے آؤ جس طرح میں نے تم سے تفصیل بیان کی۔

یہ طویل قصہ اس لئے نقل کیا تا کہ اندازہ ہو کہ اہلِ ذوق کا حج کس طرح ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ اپنے لطف و کرم سے کچھ ذائقہ اس نوع کے حج کا ہم سب کو بھی عطا فرمائے۔ (آمین)۔

(ماخوذ فضائل حج)

زیارتِ مدینہ

ملاّ قاری رحمہ اللہ تعالیٰ جو مشہور عالم، فقیہہ، محدث حنفی ہیں، انہوں نے لکھا ہے کہ چند حضرات کے علاوہ جن کا اختلاف کچھ معتبر نہیں، تمام مسلمانوں کے نزدیک بالاتفاق حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت اہم ترین نیکی ہے اور افضل ترین عبادت ہے اور اعلیٰ درجات تک پہنچنے کے لئے کامیاب ذریعہ اور پر امید وسیلہ ہے، اس کا درجہ وجوب کے قریب ہے، بلکہ بعض علماء نے مدینہ منورہ کی زیارت کو ہر اس شخص کے لئے واجب قرار دیا ہے جس کے پاس وہاں حاضری کی وسعت ہو، اس کا چھوڑنا بڑی غفلت ہے۔

شافعیہ کے مقتدا امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں کہ حج سے فارغ ہو تو چاہئے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کی زیارت کی نیت سے مدینہ منورہ کا ارادہ کرے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کی زیارت اہم ترین قربت اور کامیاب مساعی سے ہے۔

مغنی جو فقہاء حنابلہ رحمہم اللہ تعالیٰ کی بہت معتبر کتاب ہے، اس میں لکھا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر شریف کی زیارت مستحب ہے۔ اس لئے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ: جو شخص حج کرے پھر میری قبر کی زیارت کرے، اس نے گویا زندگی میں میری زیارت کی۔ اور ایک حدیث میں ہے کہ جس نے میری قبر کی زیارت کی، اس کے لئے میری شفاعت واجب ہوگئی۔

اور امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث نقل کی کہ: ''جو شخص میری قبر کے پاس مجھ پر سلام کرے تو میں اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں۔''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے متعدد روایات میں اس کی ترغیب وارد ہوئی ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

﴿عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ تعَالٰی عَنْہُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ زَارَ قَبْرِیْ وَجبَتْ لَہٗ شَفَاعَتِیْ.﴾

(رواہ البزاز والدارقطنی قالہ النووی)

ترجمہ: ''حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ جس شخص نے میری قبر کی زیارت کی اس کے لئے میری شفاعت ضروری ہوگئی۔''

﴿عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ تعَالٰی عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ جاءَ نِیْ زَائِرًا لَا یُھِمُّہٗ اِلَّا زِیَارَتِیْ کَانَ حَقًّا عَلَیَّ اَنْ اَکُوْنَ لَہٗ شَفِیْعًا﴾ (قال العراقی رواہ الطبرانی)

ترجمہ: ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو میری زیارت کو آئے اور اس کے سوا کوئی اور نیت اس کی نہ ہو تو مجھ پر حق ہو گیا کہ اس کی سفارش کروں۔''

﴿عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ زَارَنِیْ بَعْدَ وَفَاتِیْ فَکَأَنَّمَا زَارَنِیْ فِیْ حَیَاتِیْ﴾

(رواہ الطبرانی والدارقطنی والبیہقی وضعفہ وکذا فی الاتحاف وفی المشکوٰۃ بروایۃ البیہقی)

ترجمہ: ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس نے میری وفات کے بعد میری زیارت کی تو وہ ایسا ہے گویا کہ میری زندگی میں میری زیارت کی۔''

﴿عَنْ رَجُلٍ مِّنْ اٰلِ الْخَطَّابِ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ زَارَنِیْ مُتَعَمِّدًا کَانَ فِیْ جِوَارِیْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ وَمَنْ سَکَنَ

الْمَدِيْنَةَ وَصَبَرَ عَلٰى بَلَائِهَا كُنْتُ لَهٗ شَهِيْدًا وَشَفِيْعًا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَمَنْ مَاتَ فِيْ اَحَدِ الْحَرَمَيْنِ بَعَثَهُ اللّٰهُ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾

(رواہ البیہقی)

ترجمہ: ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا گیا کہ جو شخص ارادہ کر کے میری زیارت کرے، وہ قیامت میں میرے پڑوس میں ہوگا اور جو شخص مدینہ میں قیام کرے اور وہاں کی تنگی اور تکلیف پر صبر کرے میں اس کے لئے قیامت میں گواہ اور سفارشی ہوں گا اور جو حرم مکہ مکرمہ یا حرمِ مدینہ میں مرجائے گا، وہ قیامت میں امن والوں میں اٹھے گا۔''

(ماخوذ از فضائل حج، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحاً فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَاباً ﴾ (سورہ الفرقان:۷۱)

ترجمہ: ''اور جو شخص توبہ کرتا ہے اور نیک عمل کرتا ہے تو وہ اللہ کی طرف خاص طور پر رجوع کرتا ہے۔''

جہاد

(جہاد کی فرضیت چند قرآنی آیات کی روشنی میں)

اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔

﴿ وَقَاتِلُوْا فِی سَبِیْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴾

(البقرۃ:۲۴۴)

ترجمہ: ''اور لڑو اللہ کے راستے میں اور جان لو بے شک اللہ تعالیٰ خوب سننے والے اور خوب جاننے والے ہیں۔''

اللہ جل شانہٗ نے فرمایا:

﴿ فَاقْتُلُوْا الْمُشْرِكِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ﴾ (التوبۃ:۵)

ترجمہ: ''ان مشرکوں کو جہاں پاؤ، مارو اور پکڑو اور گھیرو اور ہر جگہ ان کی تاک میں بیٹھو۔''

اللہ جل شانہٗ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَّ بِیَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَ مَسَاجِدُ یُذْكَرُ فِیْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِیْرًا وَّ لَیَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ﴾ (الحج:۴۰)

ترجمہ: ''اور اگر اللہ تعالیٰ (ہمیشہ سے) لوگوں کا ایک دوسرے (کے ہاتھ) سے زور نہ گھٹاتا، تو نصاریٰ کے خلوت خانے اور عبادت خانے اور یہود کے عبادت خانے اور وہ مسجدیں جن میں بکثرت اللہ کا نام لیا جاتا

ہے، سب ڈھا دیئے جاتے اور بے شک اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے گا جو اللہ کے دین کی مدد کرے گا، بے شک اللہ تعالیٰ قوت والا (اور) غلبے والا ہے۔''

اس آیتِ کریمہ کی تفسیر میں امام ابوعبداللہ الحلیمی اپنی کتاب شعب الایمان میں ارشاد فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ مبارکہ میں یہ بات کھول کر سمجھا دی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ (مجاہد) مسلمانوں کے ذریعے سے مشرکوں کو نہ روکیں اور مسلمانوں کو اس بات کی قوت عطا نہ فرمائیں کہ وہ مشرکوں اور کافروں سے مرکزِ اسلام کا دفاع کر سکیں اور کافروں کی طاقت کو توڑ سکیں اور ان کی قوت کو پارہ پارہ کر سکیں تو مشرک زمین پر چھا جائیں گے اور دین تباہ و برباد ہو جائے گا۔

پس یہ بات ثابت ہوگئی کہ جہاد ہی دین کی بقاء اور دینداروں کی اپنی عبادات میں آزادی کا واحد راستہ ہے۔ اس لئے وہ ارکان ایمان میں سے ایک رکن ہے۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ جس قدر ہو سکے وہ اپنے اندر جہاد کی حد درجہ حرص پیدا کریں۔''

(کتاب المنہاج فی شعب الایمان جلد۲ صفحہ ۴۲۶)

اللہ تبارک تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ﴾ (سورۂ محمد: ۴)

ترجمہ: ''پس جب تمہارا کافروں سے مقابلہ ہو تو ان کی گردنیں مارو۔''

آیتِ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ اے مسلمانو! تم پر میدان جنگ میں کافروں کی گردنیں اڑانا لازم ہے۔ یہ چند آیات تو بطور نمونہ ہیں، ورنہ وہ آیات جن میں اللہ تبارک تعالیٰ نے مسلمانوں کو مشرکین اور اسلام دشمنوں کے ساتھ جہاد کا حکم دیا ہے بہت زیادہ ہیں۔

جہاد کی فرضیت چند احادیثِ شریفہ کی روشنی میں

✲ بخاری اور مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ مجھے (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) حکم دیا گیا ہے کہ میں اس وقت تک لوگوں سے قتال کرتا رہوں، جب تک کہ وہ "لآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ" کا اقرار نہ کرلیں، پھر جب وہ "لآ اِلٰـہ اِلَّا اللّٰہُ" کا اقرار کرلیں گے، تو ان کی جان و مال سوائے شرعی حق کے ہم سے محفوظ ہوجائیں گے اور ان کا حساب اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہوگا۔ (بخاری)

✲ حضرت سلمہ بن نفیل رضی اللہ تعالی عنہ فرماتے ہیں کہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا کہ ایک شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہنے لگے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! گھوڑے چھوڑ دیئے گئے ہیں اور اسلحہ رکھ دیا گیا ہے اور کچھ لوگوں نے یہ گمان کرلیا ہے کہ اب لڑائی (جہاد) ختم ہوچکی ہے۔ (یہ سن کر) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ لوگ (جو جہاد ختم ہونے کا گمان کر رہے ہیں) جھوٹے ہیں۔ جہاد تو ابھی شروع ہوا ہے اور میری اُمت کی ایک جماعت ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرتی رہے گی اور اس کی مخالفت کرنے والے اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کی خاطر کچھ لوگوں کے دل ٹیڑھے کرے گا، تا کہ ان کے ذریعے ان (مجاہدین) کو روزی دے۔ (یعنی اُمت کے یہ مجاہد لوگ کافروں سے لڑیں گے، تو ان کے مال ان کے ہاتھ آئیں گے)۔ یہ (مجاہدین) قیامت تک جہاد کرتے رہیں گے اور گھوڑوں کی پیشانی میں ہمیشہ کے لئے خیر رکھ دی گئی ہے، قیامت کے دن تک۔ (اور) جہاد بند نہیں ہوگا۔ یہاں تک کہ یاجوج ماجوج نکل آئیں۔ (نسائی)

✲ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جہاد کرو مشرکوں کے ساتھ اپنے مال سے اور اپنی جانوں سے اور اپنی زبانوں سے۔'' (ابوداود، نسائی، حاکم وقال صحیح علی شرط مسلم)

✲ حضرت علی المرتضی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسلام کے آٹھ حصے ہیں۔ اسلام قبول کرنا ایک حصہ ہے۔ نماز ایک حصہ ہے۔ زکوۃ ایک حصہ ہے۔ حج ایک حصہ ہے۔ جہاد ایک حصہ ہے۔ رمضان کے روزے ایک حصہ ہیں۔ امر بالمعروف ایک حصہ ہے۔ نہی عن المنکر ایک حصہ ہے اور محروم ہوگیا وہ شخص جس کے پاس (ان حصوں میں سے) کوئی حصہ بھی نہ ہو۔'' (ابویعلی)

فائدہ: یہی روایت حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی مروی ہے۔

(مصنف ابن ابی شیبہ)

فائدہ: حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی ایسی ہی روایت ہے۔

(مصنف ابن ابی شیبہ)

✲ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ارشاد فرماتی ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہجرت کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''فتح مکہ کے بعد ہجرت باقی نہیں رہی، البتہ جہاد اور نیتِ جہاد باقی ہے اور جب تمہیں (امیر کی طرف سے) نکلنے کا حکم دیا جائے تو تم (جہاد میں) نکل پڑو۔'' (مسلم)

فائدہ: یہی حدیث بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی مروی ہے۔

✲ عبدالمومن خالد کہتے ہیں مجھ سے نجدہ بن نفیع نے بیان کیا کہ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے قرآن مجید کی اس آیت: ''اَلَّا تَنْفِرُوْا

یَعۡذِبۡکُمۡ“ (اگر تم جہاد میں نہیں نکلو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں دردناک عذاب دے گا۔) (التوبۃ: ۳۹) کا مطلب پوچھا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے قبائل میں سے ایک قبیلہ کو جہاد میں نکلنے کا حکم دیا، تو انہوں نے سستی کی، پس اللہ تعالیٰ نے ان پر بطور عذاب کے بارش بند کردی۔ (ابوداود، حاکم)

❊ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبے میں جہاد کا ذکر فرمایا اور فرض نماز کے علاوہ کسی عمل کو جہاد سے افضل قرار نہیں دیا۔ (ابوداؤد، بیہقی)

حضرت عبداللہ بن مبارک عطیہ بن ابی عطیہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کوفہ کی لڑائی کے دنوں میں حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھا کہ وہ (شوق جہاد میں) اپنی لمبی زرہ کو لشکر کی صفوں کے درمیان گھسیٹتے پھر رہے تھے۔

(کتاب الجہاد لابن مبارک)

ان لوگوں کے لئے بعض وعیدوں کا بیان جو جہاد کو چھوڑ دیں، اس سے پہلوتہی کریں یا بغیر جہاد کے مرجائیں

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

❊ ﴿قُلۡ اِنۡ کَانَ اٰبَآؤُکُمۡ وَاَبۡنَآؤُکُمۡ وَاِخۡوَانُکُمۡ وَاَزۡوَاجُکُمۡ وَعَشِیۡرَتُکُمۡ وَاَمۡوَالُ ۨ اقۡتَرَفۡتُمُوۡهَا وَتِجَارَةٌ تَخۡشَوۡنَ کَسَادَهَا وَمَسٰکِنُ تَرۡضَوۡنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَیۡکُمۡ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَجِهَادٍ فِیۡ سَبِیۡلِهٖ فَتَرَبَّصُوۡا حَتّٰی یَاۡتِیَ اللّٰهُ بِاَمۡرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهۡدِی الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِیۡنَ ۝﴾ (التوبۃ: ۲۴)

ترجمہ: ”آپ فرما دیجئے اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارا خاندان اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت

جس کے بند ہو جانے کا تم کو ڈر ہے اور وہ گھر جس کو تم پسند کرتے ہو، تم کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے راستے میں جہاد کرنے سے زیادہ پیارے ہیں، تو تم انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم (عذاب وسزا) بھیج دیں اور اللہ تعالیٰ نافرمانوں کو ہدایت نہیں دیتے۔"

اس آیت شریفہ میں ان لوگوں کے لئے کافی تنبیہ، اور دعوتِ خوف ہے جو بے رغبتی یا اہل و مال میں مگن ہونے کی وجہ سے جہاد چھوڑ دیتے ہیں۔

✲ ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ؕ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝ اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّ يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ ﴾ (التوبۃ: ۳۸، ۳۹)

ترجمہ: "اے ایمان والو! تم لوگوں کو کیا ہوا جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے راستے میں (جہاد کے لئے) کوچ کرو، تو تم زمین پر گرے جاتے ہو۔ کیا تم آخرت کو چھوڑ کر دُنیا کی زندگی پر راضی ہو چکے ہو؟ (حالانکہ) دُنیا کی زندگی کا نفع اٹھانا تو آخرت کے مقابلے میں (کچھ بھی نہیں) بہت تھوڑا ہے۔ اگر تم (جہاد میں) نہیں نکلو گے، تو اللہ تعالیٰ تم کو سخت سزا دے گا اور تمہارے بدلے دوسری قوم کو پیدا کر دے گا (اور ان سے اپنا کام لے گا) اور تم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔"

چند احادیث

✲ حضرت ابن عمرو القرشی سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بے شک گنہگار آدمی کے گناہ اُسے جہاد سے اسی طرح روکے رکھتے

ہیں جس طرح قرض خواہ اپنے مقروض کو۔ (شفاء الصدور)

❋ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص اس حال میں مرگیا کہ نہ تو اس نے جہاد کیا اور نہ اس کے دل میں جہاد کا شوق ابھرا تو وہ نفاق کے ایک حصہ پر مرا۔ (صحیح مسلم)

❋ حضرت ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے (خود بھی) جہاد نہ کیا اور نہ کسی مجاہد کو سامانِ جہاد فراہم کیا اور نہ کسی مجاہد کے پیچھے اس کے گھر والوں کی بھلائی کے ساتھ دیکھ بھال کی، تو اللہ تعالیٰ قیامت سے پہلے اسے کسی مصیبت میں مبتلا فرما دیں گے۔ (ابوداود، ابن ماجہ)

اے مسلمان تجھے کس چیز نے جہاد سے روک رکھا ہے؟

اے جہاد کے فریضے کو چھوڑنے والے! اے توفیق اور حق کے راستوں سے ہٹنے والے! تو کن محرومیوں میں جا گرا ہے؟ اور کس قدر حق سے دور جا پڑا ہے؟ کاش تو بھی بہادروں کے ساتھ معرکوں میں حصہ لیتا! تو بھی اللہ کے راستے میں جان و مال لٹاتا! مگر تجھے اس سعادت سے روک رکھا ہے یا تو لمبی امیدوں نے یا موت کے خوف نے یا تجھ پر اپنے محبوب مال اور خاندان کی جدائی شاق ہے یا تیرے لئے اپنے بیٹوں، خادموں اور اہل خاندان کے جھرمٹ سے نکلنا مشکل ہے۔

اے جہاد سے محروم رہنے والے! یا تو تیری محرومی کا سبب تیرا کوئی پیارا بھائی یا محبوب دوست ہے یا پھر تو زیادہ سے زیادہ نیک اعمال کرنے میں ایسا لگ گیا ہے کہ جہاد تجھے یاد بھی نہیں رہا۔ یا تو اپنی خوبصورت اور باوقار بیوی کی وجہ سے رکا ہوا ہے یا تیری عزت اور تیرا منصب تیرے پاؤں کی بیڑی بنا ہوا ہے یا تو اپنی خوبصورت کوٹھی اور سائے دار باغات میں مست ہو چکا ہے یا پھر شاہانہ لباس اور لذیذ کھانے تجھے جہاد

میں نہیں نکلنے دیتے۔ ان چیزوں کے علاوہ اور کچھ ایسا نہیں جو تجھے تیرے رب سے دور کردے اور اگر ان چیزوں نے تجھے تیرے رب سے دور کر رکھا ہے، تو یہ تیرے لئے اچھی بات نہیں ہے۔

اے دھوکے میں پڑے ہوئے انسان! یاد رکھ، موت کی ایک خاص سختی ہوتی ہے۔ اور روح نکلنے کا وقت بہت سخت ہے، لیکن تم اسے ابھی نہیں سمجھتے اور قبر میں عذاب بھی ہوتا ہے اور اس عذاب سے صرف نیک لوگ محفوظ رہتے ہیں۔ قبر میں دو سخت فرشتے سوال بھی کریں گے، تب کیا ہوگا؟ پھر اس خوفناک منظر کے بعد خوش قسمت لوگ ہمیشہ کی نعمتوں میں اور بدنصیب لوگ سخت عذاب میں ڈال دیئے جائیں گے۔ مگر شہید کے لئے امن ہی امن ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''شہید کو قتل کے وقت صرف اتنا درد ہوتا ہے جتنا چیونٹی کے کاٹنے کا۔''

(ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

اے مسلمان بھائی! اب کون سی چیز ہے جو تجھے اس سعادت کو حاصل کرنے سے روک رہی ہے؟ جسے پانے کے بعد تو عذابِ قبر سے بھی بچ جائے گا اور اللہ کے ہاں بھی کامیاب ہو کر بہترین ٹھکانہ پائے گا اور قبر کے سوال سے بھی محفوظ رہے گا؟ شہداء تو زندہ ہوتے ہیں، اپنے رب کی طرف سے ملنے والی روزی کھاتے پیتے ہیں، نہ انہیں کوئی خوف ہوتا ہے نہ غم۔ ان کی روحیں سبز پرندوں میں ڈال دی جاتی ہیں۔

دیکھو کتنا بڑا فرق ہے شہادت جیسی عزّت والی موت اور بستر کی دردناک موت کے درمیان............؟

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ: جنت کی تم میں سے کسی ایک کے کوڑے جتنی جگہ دنیا و مافیھا سے بہتر ہے اور اللہ کے راستے میں ایک صبح یا شام کا لگانا دُنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے اس سے بہتر ہے۔ (صحیح بخاری)

کہیں ایسا تو نہیں کہ اِس مال کی محبت تجھے آڑے آ رہی ہو؟ ہاں وہی مال جس کے بارے میں قیامت کے دن تجھ سے پوچھا جائے گا کہ یہ کہاں سے کمایا تھا؟ اور کہاں خرچ کیا؟ وہی قیامت کا دن جس میں مالدار لوگوں سے ایک ایک پائی کا حساب لیا جائے گا، جبکہ فقراء مالداروں سے پانچ سو سال پہلے جنت میں داخل ہو کر مزے اڑائیں گے۔ مگر اے مالدار! اس دن تو اپنے مال کی وجہ سے روک لیا جائے گا اور تیرے لئے خطرہ ہوگا کہ کہیں تو دوزخ کے داروغہ ''مالک'' کے حوالے نہ کر دیا جائے۔

اے مسلمان! آج اگر تو دنیا کے دھوکے میں آ کر اسی مال پر جھکا ہوا ہے تو یاد رکھ کہ ایک نہ ایک دن اس مال کو چھوڑنا ہے۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ارشاد فرمایا کہ: کیا میں تمہیں دنیا کی پوری حقیقت نہ دکھاؤں؟ میں نے کہا کیوں نہیں۔ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے مدینہ کی وادیوں میں سے ایک وادی میں ایک کوڑے کے ڈھیر پر لے آئے۔ اس (کوڑے کے ڈھیر) میں مردہ انسانوں کی کھوپڑیاں، انسانی غلاظتیں، پرانے چیتھڑے اور مردہ جانوروں کی ہڈیاں تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ابو ہریرہ! یہ سر (کسی زمانہ میں) انہیں چیزوں کا حرص رکھتے تھے جن کا حرص تم رکھتے ہو۔ اور ان سروں میں وہ ساری امیدیں (اور امنگیں) روشن تھیں، جو آج تم نے لگا رکھی ہیں، مگر آج یہ سر بغیر کھال کی ہڈیاں ہیں، پھر کچھ عرصے بعد یہ گل کر خاک ہو جائیں گی۔ اور یہ غلاظتیں ان کے رنگا رنگ کھانے ہیں، جنہیں انہوں نے جہاں سے ہو سکا کمایا، پھر ان کھانوں کو اپنے پیٹ میں ڈال دیا اور وہ اس شکل میں ہو گئے کہ اب لوگ ان سے دور بھاگتے ہیں اور یہ بوسیدہ چیتھڑے ان کے زیب و زینت والے عمدہ لباس تھے، مگر آج ہوائیں انہیں اڑاتی پھر رہی ہیں۔ اور یہ ہڈیاں ان

کے وہ جانور تھے جن پر وہ ملکوں اور شہروں میں گھومتے پھرتے تھے۔ پس جو دنیا پر رونا چاہے اسے چاہئے کہ روئے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم برابر روتے رہے یہاں تک کہ ہمارا رونا شدت پکڑ گیا۔ (احیاءعلوم الدین)

اے مسلمان بھائیو! تمہیں جہاد سے دنیا کی کوئی چیز بھی غافل نہ کرنے پائے۔ یہ دنیا رہنے کی یا آپس میں کچھ جمع کرنے کی جگہ نہیں ہے، یہاں جو آج ہنستا ہے اسے کل رونا پڑتا ہے، یہاں کی خوشیوں کے پیچھے غم چھپے ہوئے ہیں، یہ دنیا بے وفائی مصیبتوں اور تھکاوٹوں کا گھر ہے، جو اسے پانے کا ارادہ کرتا ہے، وہ اس کے دھوکے اور جال میں پھنس جاتا ہے، اور اس پر اس دنیا کی مصیبتیں چھا جاتی ہیں اور پھر وہ پچھتاتا ہے اور آنسوؤں کی جگہ آنکھوں سے خون برساتا ہے۔

اے مسلمانو! اِس غفلت سے بیدار ہوجاؤ اور اس سے پہلے کہ دُنیا کی گرفت تم پر مضبوط ہوجائے خود کو اس کی قید سے چھڑا لو اور توفیق اور سعادت مندی کے راستے (جہاد فی سبیل اللہ) کو اختیار کرو۔ کیا پتہ اللہ تعالیٰ تمہیں شہادت کی عظیم نعمت عطا فرما دے۔

اے محمدِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے سپاہیو! آج اسلام کی عزت کا مسئلہ ہے۔ تمہاری غیرت کس طرح یہ بات گوارا کرتی ہے کہ جن علاقوں کو تمہارے پاک نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا پاک خون اور پسینہ بہا کر آزاد کرایا تھا، اب وہ پھر یہودیوں کی دسترس میں ہیں۔

فضول لفظی بحثیں چھوڑو، زمین پر دیکھو! کفر تمہیں چیلنج کررہا ہے اور آسمان کی طرف دیکھو! رب کے فرشتے اتر کر تمہارے ساتھ لڑنے کے منتظر ہیں۔

(ماخوذ فضائل جہاد (کامل) ازقلم مولانا محمد مسعود اظہر صاحب)

نورِ ایمان کے اجزائے ترکیبی

(نورِ فطرت اور نورِ وحی)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ط اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ط اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ لا يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ط نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ط يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ط وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ط وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ <> فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ لا يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۝ رِجَالٌ لا لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ اِقَامِ الصَّلٰوةِ وَ اِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ لا يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ۝ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ط وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝﴾

(سورۂ نور آیت ۳۵، ۳۸)

ترجمہ: ''اللہ نور ہے زمین اور آسمانوں کا، اس کے نور کی مثال (ایسی ہے) جیسے ایک طاق ہو، اس میں ایک چراغ ہو، چراغ ایک شیشہ کی (قندیل میں) ہو، وہ شیشہ گویا ایک چمکدار ستارہ ہے، وہ روشن کیا جاتا ہے مبارک درخت زیتون سے (جس کا رخ) نہ مشرق ہے نہ مغرب، قریب ہے کہ اس کا تیل روشن ہوجائے خواہ اسے آگ نہ چھوئے، سراسر

روشنی ہے، اللہ جس کو چاہتا ہے اپنے نور کی طرف راہ نمائی کرتا ہے اور اللہ لوگوں کے لئے مثالیں بیان کرتا ہے اور اللہ ہر شے کو جاننے والا ہے۔ (یہ روشنی ہے) ان گھروں میں (جن کی نسبت) اللہ نے حکم دیا ہے کہ انہیں بلند کیا جائے اور ان میں اس کا نام لیا جائے، وہ اُن میں صبح و شام اُس کی تسبیح کرتے ہیں، وہ لوگ جنہیں غافل نہیں کرتی کوئی تجارت، نہ خرید و فروخت اللہ کی یاد سے، نماز قائم رکھنے اور زکوۃ ادا کرنے سے، وہ اس دن سے ڈرتے ہیں، جس میں الٹ جائیں گے دل اور آنکھیں، تاکہ اللہ اُن کے اعمال کی بہتر سے بہتر جزا دے، اور انہیں اپنے فضل سے زیادہ دے، اور اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔"

آیتِ مذکورہ کو اہلِ علم آیتِ نور لکھتے ہیں، کیونکہ اس میں نورِ ایمان اور ظلمتِ کفر کو بڑی تفصیلی مثال سے سمجھایا گیا ہے۔

نور کی تعریف

نور کی تعریف امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمائی کہ "اَلظَّاهِرُ بِنَفْسِهٖ وَالْمُظْهِرُ لِغَيْرِهٖ" یعنی خود اپنی ذات سے ظاہر اور روشن ہو اور دوسری چیزوں کو ظاہر و روشن کرنے والا ہو۔ اور تفسیر مظہری میں ہے کہ نور دراصل اس کیفیت کا نام ہے جس کو انسان کی قوتِ باصرہ پہلے ادراک کرتی ہے اور پھر اس کے ذریعہ ان تمام چیزوں کا ادراک کرتی ہے جو آنکھ سے دیکھی جاتی ہیں۔ جیسے آفتاب اور چاند کی شعاعیں ان کے مقابل اجسامِ کثیفہ پر پڑ کر اوّل اس چیز کو روشن کر دیتی ہیں، پھر اس سے شعاعیں منعکس ہو کر دوسری چیزوں کو روشن کرتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ لفظ نور کا اپنے لغوی اور عرفی معنے کے اعتبار سے حق تعالیٰ جل شانہٗ کی ذات پر اطلاق نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ وہ جسم اور جسمانیات سب سے بَری ہے۔ اس لئے آیتِ مذکورہ میں جو حق

تعالیٰ کے لئے لفظ نور کا اطلاق ہوا ہے اس کے معنے باتفاق ائمہ تفسیر منور یعنی روشن کرنے والے کے ہیں۔ اور آیت کے معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نور بخشنے والے ہیں آسمان وزمین کو اور اس میں بسنے والی ساری مخلوق کو، اور اس نور سے مراد ''نورِ ہدایت'' ہے۔

اللہ تعالیٰ نورِ (ہدایت) دینے والا ہے یعنی اہلِ آسمان وزمین میں جن کو ہدایت ہوئی ہے، ان سب کو اللہ ہی نے ہدایت دی ہے۔ مومن کے قلب میں اللہ تعالیٰ جب نورِ ہدایت ڈالتا ہے، تو روز بروز اسی کا انشراح قبول حق کے لئے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اور ہر وقت احکام پر عمل کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ گو بالفعل احکام کا علم بھی نہ ہوا ہو۔ کیونکہ علم تدریجاً حاصل ہوتا ہے۔ جیسے وہ روغنِ زیتون آگ لگنے سے پہلے ہی روشنی کے لئے مستعد تھا، مومن بھی علمِ احکام سے پہلے ہی ان پر عمل کے لئے مستعد ہوتا ہے اور جب اس کو علم حاصل ہوتا ہے، تو نورِ عمل یعنی عمل کے پختہ ارادے کے ساتھ نورِ علم بھی مل جاتا ہے جسے وہ فوراً ہی قبول کر لیتا ہے، پس علم وعمل مل کر نورٌ علی نورٍ بن جاتے ہیں، گویا نورٌ علی نور کا مقولہ ان دونوں پر صادق آتا ہے۔

اسی انشراح اور نور کو دوسری آیت میں اس طرح بیان فرمایا ہے۔

﴿ اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ﴾

تَرْجَمَہ: ''یعنی جس شخص کا سینہ اللہ نے اسلام کے لئے کھول دیا ہے سو وہ اپنے رب کی طرف سے روشنی میں ہے۔''

غرض نورِ ہدایتِ الٰہیہ کی یہ مثال ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے اس نورِ ہدایت تک جس کو چاہتا ہے راہ دیتا ہے۔

نورِ مومن

اللہ تعالیٰ کا نورِ ہدایت جو مومن کے قلب میں آتا ہے یہ اس کی ایک عجیب مثال ہے ''مَثَلُ نُورِهٖ كَمِشْكٰوةٍ'' الآیۃ۔

یعنی یہ مثال اس مومن کی ہے، جس کے دل میں اللہ تعالیٰ نے ایمان اور قرآن کا نورِ ہدایت ڈال دیا ہے۔

اس لئے اس مثال کا حاصل یہ ہے کہ مومن کا سینہ ایک طاق اور اس (سینہ) میں اس کا دل ایک قندیل کی مثال ہے، جس میں نہایت شفاف روغنِ زیتون، (فطری نورِ ہدایت) کی مثال ہے، جو مومن کی فطرت میں ودیعت رکھا گیا ہے۔ جس کا خاصہ قبولِ حق ہے۔ پھر جس طرح روغنِ زیتون آگ کے شعلہ سے روشن ہو کر دوسروں کو روشن کرنے لگتا ہے، اسی طرح فطری نورِ ہدایت جو قلبِ مومن میں رکھا گیا ہے، جب وحیِ الٰہی اور علمِ الٰہی کے ساتھ اس کا ملاپ ہو جاتا ہے تو روشن ہو کر عالم کو روشن کرنے لگتا ہے۔ اور حضرات صحابہ و تابعین نے جو اس مثال کو قلبِ مومن کے ساتھ مخصوص فرمایا وہ بھی غالباً اس لئے ہے کہ فائدہ اس نور کا صرف مومن ہی اٹھاتا ہے۔ ورنہ وہ فطری نورِ ہدایت جو ابتداءِ تخلیق کے وقت انسان کے قلب میں رکھا جاتا ہے، وہ مومن کے ساتھ ہی مخصوص نہیں، بلکہ ہر انسان کی فطرت اور جبلت میں وہ نورِ ہدایت رکھا جاتا ہے۔

ایک صحیح حدیث سے اس عموم کی تائید ہوتی ہے، جس میں ارشاد ہے۔

﴿كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ﴾

یعنی ہر پیدا ہونے والا بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے ماں باپ اس کو فطرت کے تقاضوں سے ہٹا کر غلط راستوں پر ڈال دیتے ہیں۔ اس فطرت سے مراد ہدایتِ ایمان ہے۔ یہ ہدایتِ ایمان اور اس کا نور ہر انسان کی پیدائش کے وقت اس میں رکھا جاتا ہے اور اسی نورِ ہدایت کی وجہ سے اس میں قبولِ حق کی صلاحیت ہوتی ہے۔

جب انبیاء اور ان کے نائبین کے ذریعہ وحیٔ الٰہی کا علم ان کو پہنچتا ہے، تو وہ اس کو بسہولت قبول کر لیتے ہیں، بجز ان ممسوخ الفطرت لوگوں کے جنہوں نے اس فطری نور

کو اپنی حرکتوں ہی سے مٹا ڈالا ہے۔

اور آخر آیت میں یہ فرمایا ہے:

﴿يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ﴾

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے نور کی طرف جس کو چاہتا ہے، ہدایت کر دیتا ہے۔ یہاں مشیتِ الٰہی کی قید اس نورِ فطرت کے لئے نہیں، جو ہر انسان میں رکھا ہے، بلکہ نورِ قرآن کے لئے ہے، جو ہر شخص کو حاصل نہیں ہوتا، بجز اس خوش نصیب کے جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق نصیب ہو۔

اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔ آگے اہلِ ہدایت کا حال بیان فرماتے ہیں کہ ''وہ ایسے گھروں میں جا کر عبادت کرتے ہیں، جن کی نسبت اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ان کا ادب کیا جائے اور ان میں اللہ کا نام لیا جائے۔''

مراد اُن گھروں سے مسجدیں ہیں اور ان کا ادب یہ ہے کہ ان میں کوئی نجس چیز داخل نہ کی جائے، وہاں شور وغل نہ مچایا جائے، دنیا کے کام اور باتیں کرنے کے لئے وہاں نہ بیٹھیں۔

''اُن مسجدوں میں ایسے لوگ صبح وشام اللہ کی پاکی (نمازوں میں) بیان کرتے ہیں جن کو اللہ کی یاد سے اور نماز پڑھنے سے اور زکوۃ دینے سے نہ خرید غفلت میں ڈالنے پاتی ہے نہ فروخت۔ (اور باوجود اطاعتِ عبادت کے ان کی خشعیت کا یہ حال ہے کہ) وہ ایسے دن سے ڈرتے ہیں، جس میں بہت سے دل اور آنکھیں الٹ جائیں گی۔ اب آگے اُن کے انجام کا ذکر ہے کہ انجام (ان لوگوں کا) یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اُن کو ان کے اعمال کا بہت ہی اچھا بدلہ دے گا۔ یعنی جنت، اور ان کو اپنے فضل سے اور بھی زیادہ دے گا۔ اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہے بے شمار دے دیتا ہے۔ وہ نہ کسی قانون کا پابند ہے، نہ اس کے خزانے میں کمی آتی ہے۔

(معارف القرآن)

اولوالالباب کے ایمان کی کیفیت

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَ یَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝﴾

(سورۂ آل عمران: ۱۹۰،۱۹۱)

ترجمہ: ’’بیشک آسمان اور زمین کا بنانا اور رات دن کا آنا جانا، اس میں نشانیاں ہیں عقل والوں کے لئے، جو لوگ اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر یاد کرتے ہیں اور غور کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں، اے ہمارے رب! تو نے یہ بے فائدہ نہیں پیدا کیا، تو پاک ہے، تو بچالے ہمیں دوزخ کے عذاب سے۔‘‘

آیت کا شانِ نزول

اس آیت کے شانِ نزول کے متعلق ابن حبان نے اپنی صحیح میں اور محدث ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے کہ ابن ابی رباح رضی اللہ تعالی عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا کے پاس تشریف لے گئے اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں جو سب سے زیادہ عجیب چیز آپ نے دیکھی ہو، وہ مجھے بتلایئے۔ اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کس شان کو پوچھتے ہو؟ ان کی تو ہر شان ہی عجیب تھی۔ ہاں ایک عجیب واقعہ سناتی ہوں۔ وہ یہ ہے کہ حضور

اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رات فرمایا کہ مجھے اجازت دو کہ میں اپنے پروردگار کی عبادت کروں۔ بستر سے اٹھے، وضو فرمایا، پھر نماز کے لئے کھڑے ہوگئے اور قیام میں اس قدر روئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنسو سینۂ مبارک پر بہہ گئے، پھر رکوع فرمایا اور اس میں بھی روئے۔ پھر سجدہ کیا اور سجدہ میں بھی اسی قدر روئے، پھر سر اٹھایا اور مسلسل روتے رہے، یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ آئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز کی اطلاع دی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر کیوں گریہ فرماتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اگلے پچھلے گناہ معاف فرما دئے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں؟ اور شکریہ میں گریہ وزاری کیوں نہ کروں، جبکہ اللہ تعالیٰ نے آج کی شب مجھ پر یہ آیت مبارکہ نازل فرمائی ہے۔

﴿اِنَّ فِی خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ......﴾

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''بڑی تباہی ہے اس شخص کے لئے جس نے ان آیتوں کو پڑھا اور ان میں غور نہیں کیا۔'' اب یہاں چند امور ہیں۔

١ ...... پہلا یہ کہ ''خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ'' کے معنی یہ ہوئے کہ آسمان اور زمین کے پیدا کرنے میں اللہ تعالیٰ کی بڑی نشانیاں ہیں، اس لئے کہ اس میں وہ تمام مخلوقات اور مصنوعات باری تعالیٰ داخل ہوجاتی ہیں، جو آسمان اور زمین کے اندر ہیں۔

٢ ...... دوسرا یہ کہ اختلاف اللیل والنہار کے معنی یہ ہوئے کہ رات جاتی ہے اور دن آتا ہے اور دن جاتا ہے تو رات آتی ہے۔ اختلاف کے دوسرے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ سردیوں میں رات طویل ہوتی ہے اور دن چھوٹا ہوتا ہے اور گرمیوں میں اس کے برعکس ہوتا ہے۔

٣ ...... تیسرا امر یہ کہ لفظ ''آیات'' کے کیا معنی ہیں؟ آیات آیۃ کی جمع ہے اور یہ

لفظ چند معانی کے لئے بولا جاتا ہے۔ آیات معجزات کو بھی کہا جاتا ہے اور قرآن مجید کی آیات پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس کے تیسرے معنی دلیل اور نشانی کے بھی ہیں۔ یہاں پر یہی تیسرے معنی مراد ہیں۔ یعنی ان امور میں اللہ کی بڑی نشانیاں اور قدرت کے دلائل ہیں۔

❹ ..... چوتھا امر اولوالالباب کے معنی ہیں عقل والے۔

عقل والے صرف وہی لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے اور ہر حال میں اس کا ذکر کرتے ہیں۔ ویسے تو ساری دنیا عقلمند ہونے کی مدعی ہے۔ کوئی بیوقوف بھی اپنے آپ کو بے عقل تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ مگر قرآن کریم نے عقل والوں کی یہ علامت بتلائی:

﴿اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ﴾

ترجمہ: ''یعنی عقل والے وہ لوگ ہیں جو اللہ کو یاد کریں کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہوئے۔''

مراد یہ ہے کہ ہر حالت اور ہر وقت میں اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ آج کی دنیا نے جس چیز کو عقل اور عقلمندی کا معیار سمجھ لیا ہے، وہ محض ایک دھوکہ ہے۔ کسی نے مال و دولت سمیٹ لینے کو عقلمندی قرار دیا۔ کسی نے مشینوں کے کل پرزے بنانے کا نام عقلمندی رکھ دیا، لیکن عقل سلیم کی بات وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے انبیاء و رُسل لے کر آئے۔ عقل والے کہلانے کے مستحق صرف وہی لوگ ہیں، جو اللہ تعالیٰ کو پہچانیں اور ہر وقت ہر حالت میں اس کو یاد کریں۔ اسی لئے اولی الالباب کی صفت قرآن کریم نے یہ بتلائی۔

﴿اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ﴾

اس لئے حضرات فقہائے کرام نے لکھا ہے کہ اگر کوئی انتقال سے قبل وصیت کر جائے کہ میرا مال عقلاً کو دے دیا جائے تو کس کو دیا جائے گا؟ اس کے جواب میں

حضرات فقہائے کرام نے لکھا ہے کہ ایسے عالم زاہد اس مال کے مستحق ہوں گے جو دُنیا طلبی اور غیر ضروری مادّی وسائل سے دور ہیں۔

اس جگہ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ شریعت میں ذکر کے علاوہ کسی اور عبادت کی کثرت کا حکم نہیں دیا گیا۔ لیکن ذکر کے متعلق ارشاد ہے کہ:

﴿ اُذْكُرُ اللّٰهَ ذِكرًا كَثِيْرًا ﴾

وجہ اس کی یہ ہے کہ ذکر کے سوا ساری عبادات کے لئے کچھ شرائط اور قواعد ہیں جن کے بغیر وہ عبادات ادا نہیں ہوتیں۔ بخلاف ذکر کے کہ اس کو انسان کھڑے، بیٹھے، لیٹے ہوئے باوضو یا بے وضو ہر حالت میں اور ہر وقت انجام دے سکتا ہے۔ اس آیت میں شاید اسی حکمت کی طرف اشارہ ہے۔

آیتِ مذکورہ میں عقل والوں کی دوسری علامت یہ بتلائی گئی ہے کہ وہ آسمان و زمین کی تخلیق و پیدائش میں تفکر کرتے ہیں:

﴿ يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کا ذکر عبادت ہے، اسی طرح فکر بھی ایک عبادت ہے۔ فرق یہ ہے کہ ذکر تو اللہ جل شانہٗ کی ذات وصفات کا مطلوب ہے اور فکر وتفکر اس کی مخلوقات ومصنوعات میں مقصود ہے۔

آیتِ مذکورہ کے آخری جملے نے آیاتِ قدرت میں غور وفکر کا نتیجہ بتلایا ہے:

﴿ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ﴾

یعنی حق تعالیٰ کی عظیم اور غیر محصور مخلوقات میں غور وفکر کرنے والا اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان تمام چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے فضول و بیکار پیدا نہیں کیا ہے، بلکہ ان کی خلقت میں ہزاروں حکمتیں مضمر ہیں۔

آگے ان لوگوں کی چند درخواستوں اور دعاؤں کا ذکر ہے جو انہوں نے اپنے رب کو پہچان کر اس کی بارگاہ میں پیش کیں۔

پہلی درخواست یہ ہے کہ "فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ"

یعنی ہمیں جہنم کے عذاب سے بچائیے۔ دوسری درخواست یہ ہے کہ ہمیں آخرت کی رسوائی سے بچائیے۔ بعض علما نے لکھا ہے کہ میدان حشر کے اندر رسوائی ایک ایسا عذاب ہوگا کہ آدمی یہ خواہش کرے گا کہ کاش! اسے جہنم میں ڈال دیا جائے لیکن اس کی بدکاریوں کا چرچا اہل محشر کے سامنے نہ ہو۔

تیسری درخواست یہ ہے کہ ہم نے آپ کی طرف سے آنے والے منادی یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز کو سنا اور اس پر ایمان لائے، تو آپ ہمارے بڑے گناہوں کو معاف فرما دیں۔ اور ہمیں نیک لوگوں کے زمرے میں شامل فرمالیں۔

یہ تین درخواستیں تو عذاب اور تکلیف کی مضرت سے بچنے کے لئے تھیں۔ آگے چوتھی درخواست فوائد اور منافع حاصل کرنے کے متعلق ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ جو وعدہ آپ نے جنت کی نعمتوں کا فرمایا ہے، وہ ہمیں اس طرح عطا فرمایئے کہ قیامت میں رسوائی بھی نہ ہو اور ہم یہ وعدہ حاصل کرنے کے مستحق ہو جائیں اور پھر اس پر قائم رہیں یعنی خاتمہ ایمان اور عملِ صالح پر ہو۔

(معارف القرآن)

بندۂ مومن کی شخصیت کے خدوخال

قرآن کریم میں ارشاد ہے:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّ
قَمَرًا مُّنِيْرًا ۝ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ
يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ۝ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى
الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ۝ وَالَّذِيْنَ
يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ۝ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا
عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ۝ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا
وَّمُقَامًا ۝ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ
ذٰلِكَ قَوَامًا ۝ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ
النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ
اَثَامًا ۝ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ۝
اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صٰلِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ
حَسَنٰتٍ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا
فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ۝ وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَاِذَا
مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ۝ وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ
يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّ عُمْيَانًا ۝ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ
اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ۝ اُولٰٓئِكَ

يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا ۝ قُلْ مَايَعْبَؤُابِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ۝

(سورۃ الفرقان: ۶۱،۷۷)

ترجمہ: ”بڑی برکت والا ہے وہ جس نے آسمانوں میں برج بنائے اور اُس میں بنایا سورج اور روشن چاند اور وہی ہے جس نے رات دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے والا بنایا۔ یہ اس کے سمجھنے کے لئے ہیں جو چاہے کہ نصیحت پکڑے، یا شکر گزار بننا چاہے اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر چلتے ہیں آہستہ آہستہ اور جب جاہل ان سے بات کرتے ہیں تو وہ بس سلام کہتے ہیں۔ اور وہ اپنے رب کے لئے رات کاٹتے ہیں (رات بھر لگے رہتے ہیں) سجدہ کرتے اور قیام کرتے۔ اور وہ جو کہتے ہیں اے ہمارے رب! ہم سے جہنم کا عذاب پھیر دے۔ بیشک اس کا عذاب لازم ہوجانے والا ہے۔ بیشک وہ بری ہے ٹھہرنے کی جگہ اور برا ہے مقام اور وہ لوگ کہ جب وہ خرچ کرتے ہیں نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ تنگی کرتے ہیں (ان کی رَوِش) اس کے درمیان اعتدال کی ہے۔ اور وہ جو اللہ کے ساتھ نہیں پکارتے دوسرا (کوئی اور) معبود، اور اس جان کو قتل نہیں کرتے جسے قتل کرنا اللہ نے حرام کیا ہے۔ مگر جہاں حق ہو اور وہ زنا نہیں کرتے اور جو یہ کرے گا وہ بڑی سزا سے دوچار ہوگا۔ روزِ قیامت اس کے لئے عذاب دوچند کر دیا جائے گا۔ اور وہ اس میں ہمیشہ رہے گا، خوار ہوکر۔ سوائے اس کے جس نے توبہ کی اور وہ ایمان لایا اور اس نے نیک عمل کئے۔ پس اللہ ان لوگوں کی برائیاں بدل دے گا بھلائیوں سے اور اللہ بخشنے والا نہایت مہربان ہے۔ اور جس نے توبہ کی اور نیک عمل کئے

تو وہ بیشک رجوع کرتا ہے اللہ کی طرف (جیسے) رجوع کرنے کا مقام (حق) ہے اور وہ لوگ جو جھوٹ کی گواہی نہیں دیتے اور جب بیہودہ چیزوں کے پاس سے گزریں تو گزرتے ہیں بزرگانہ (سنجیدگی کے انداز سے) اور وہ لوگ کہ جب انہیں ان کے رب کے احکام سے نصیحت کی جاتی ہے، تو وہ ان پر بہروں اور اندھوں کی طرح نہیں گر پڑتے اور وہ لوگ جو کہتے ہیں اے ہمارے رب! ہمیں ہماری بیویوں اور ہماری اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما، اور ہمیں بنادے پرہیز گاروں کا پیشوا۔ اُن لوگوں کو ان کے صبر کی بدولت (جنت کے) بالاخانے انعام میں دیئے جائیں گے اور وہ اُس میں دعائے خیر اور سلام سے پیشوائی کئے جائیں گے۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (کیا ہی) اچھی ہے آرام گاہ، اور اچھا مسکن۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیں اگر تم اُس کو نہ پکارو، تو میرا رب تمہاری پرواہ نہیں رکھتا، تم نے جھٹلایا، پس عنقریب (اس کی سزا) لازمی ہوگی۔"

وہ ذات بہت عالیشان ہے جس نے آسمان میں بڑے بڑے ستارے بنائے۔ (اور ان ستاروں میں سے دو بڑے نورانی اور فائدہ بخش ستارے بنائے یعنی) آسمان میں ایک چراغ (یعنی آفتاب) اور نورانی چاند بنایا۔ اور وہ ایسا ہے جس نے رات اور دن ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے والے بنائے۔ (اور یہ سب کچھ جو دلائلِ توحید اور اللہ کی نعمتوں کا ذکر ہوا ہے اس شخص کے سمجھنے کے لئے ہیں جو سمجھنا چاہے یا شکر کرنا چاہے۔)

سورۂ فرقان کے بیشتر مضامین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت کے ثبوت اور کفار و مشرکین جو اس پر اعتراض کرتے تھے، ان کے جوابات پر مشتمل تھے اور اس میں کفار و مشرکین اور احکام کی نافرمانی کرنے والوں پر عذاب و سزا کا بھی

ذکر تھا۔

آخر سورت میں اپنے اُن مخصوص اور مقبول بندوں کا ذکر فرماتے ہیں جن کا رسالت پر ایمان بھی مکمل ہے اور ان کے عقائد و اعمال، اخلاق، عادات سب اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کے تابع اور احکامِ شرعیہ کے مطابق ہیں۔

قرآنِ کریم نے ایسے مخصوص بندوں کو "عِبَادُ الرَّحمَان" کا لقب عطا فرمایا جو اس کا سب سے بڑا اعزاز ہے۔ یوں تو ساری ہی مخلوق تکوینی اور جبری طور پر اللہ کی بندگی اور اس کی مشیت و ارادہ کے تابع ہے۔ اُس کے ارادے کے بغیر کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ مگر یہاں بندگی سے مراد اختیاری بندگی ہے۔ یعنی اپنے اختیار سے اپنے وجود اور اپنی تمام خواہشات اور تمام کاموں کو اللہ کی مرضی کے تابع بنا دینا۔ ایسے مخصوص بندے جن کو حق تعالیٰ نے خود اپنا بندہ کہہ کر عزّت بخشی ہے، ان کے اوصاف آخر سورت تک بیان کئے گئے ہیں۔ درمیان میں کفر و معصیت سے توبہ اور اس کے اثرات کا ذکر آیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کی مخصوص صفات و علامات

آیاتِ مذکورہ میں اللہ کے مقبول اور مخصوص بندوں کی تیرہ صفات و علامات کا ذکر آیا ہے، جن میں عقائد کی درستی اور اپنے ذاتی اعمال ہیں۔ خواہ وہ بدن سے متعلق ہوں یا مال سے، سب میں اللہ و رسول کے احکام اور مرضی کی پابندی، دوسرے انسان کے ساتھ معاشرت اور تعلقات کی نوعیت، رات دن کی عبادت گزاری کے ساتھ خوفِ خدا، تمام گناہوں سے بچنے کا اہتمام اور اپنے ساتھ اپنی اولاد و ازواج کی اصلاح کی فکر وغیرہ شامل ہیں۔

پہلی صفت: سب سے پہلا وصف عباد ہونا ہے۔ عباد عبد کی جمع ہے عبد کا ترجمہ ہے بندہ۔

اللہ تعالیٰ کا بندہ کہلانے کا مستحق وہی شخص ہوسکتا ہے جو اپنے عقائد، خیالات، اپنے ہر ارادے اور خواہش کو اور اپنی ہر حرکت اور سکون کو اپنے رب کے حکم اور مرضی کے تابع رکھے۔ ہر وقت گوش برآواز رہے کہ جس کام کا حکم ہو وہ بجالاؤں۔

دوسری صفت: "یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا" یعنی چلتے ہیں وہ زمین پر تواضع کے ساتھ۔ لفظ هَوْنَ کا مفہوم اس جگہ وقار اور تواضع ہے کہ اکڑ کر نہ چلے، قدم متکبرانہ انداز سے نہ رکھے۔ (بہت آہستہ چلنا مراد نہیں، کیونکہ وہ بلا ضرورت ہو تو خلاف سنت ہے۔) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چلنے کی جو صفت شمائل نبویہ میں منقول ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چلنا بہت آہستہ نہیں، بلکہ کسی قدر تیزی کے ساتھ تھا۔ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ بہت آہستہ چل رہا ہے۔ پوچھا کیا تم بیمار ہو؟ اس نے کہا نہیں۔ تو آپ نے اس پر دُرّہ اٹھایا اور حکم دیا کہ قوت کے ساتھ چلا کرو۔

تیسری صفت: "وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا" یعنی جب جہالت والے ان سے خطاب کرتے ہیں، تو وہ کہتے ہیں سلام۔

یہاں جَاهِلُوْنَ کا ترجمہ جہالت والوں سے کر کے یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ مراد اِس سے بے علم آدمی نہیں، بلکہ وہ جو جہالت کے کام اور جاہلانہ باتیں کرے، خواہ واقع میں وہ ذی علم بھی ہو۔

اور لفظ سلام سے مراد یہاں عرفی سلام نہیں، بلکہ سلامتی کی بات ہے۔ مراد یہ ہے کہ جاہلوں کے جواب میں وہ سلامتی کی بات کہتے ہیں، جس سے دوسروں کو ایذا نہ پہنچے اور یہ گنہگار نہ ہو۔ حاصل یہ ہے کہ بے وقوف اور جاہلانہ باتیں کرنے والوں سے یہ حضرات انتقامی معاملہ نہیں کرتے، بلکہ اُن سے درگزر کرتے ہیں۔

چوتھی صفت: "وَالَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِیَامًا" یعنی وہ رات گزارتے

ہیں اپنے رب کے سامنے سجدہ کرتے ہوئے اور قیام کرتے ہوئے۔

عبادت میں شب بیداری کا ذکر خصوصیت سے اس لئے کیا گیا ہے کہ یہ وقت سونے اور آرام کرنے کا ہے، اس میں نماز اور عبادت کے لئے کھڑا ہونا خاص مشقت بھی ہے اور اس میں ریا ونمود کے خطرات بھی نہیں ہیں۔ منشا یہ ہے کہ ان کا لیل ونہار اللہ کی طاعت میں مشغول ہے۔ دن کو تعلیم وتبلیغ اور جہاد فی سبیل اللہ وغیرہ کے کام ہیں۔ رات کو اللہ کے سامنے عبادت گزاری کرنا ہے۔

تہجد کی نماز کی حدیث میں بڑی فضیلت آئی ہے۔ ترمذی نے حضرت ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: قیام اللیل، یعنی تہجد کی پابندی کرو، کیونکہ وہ تم سے پہلے بھی سب نیک بندوں کی عادت رہی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے تم کو قریب کرنے والی اور سیئات کا کفارہ ہے۔ اور گناہوں سے روکنے والی چیز ہے۔ (مظہری)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ: جس شخص نے عشاء کے بعد دو یا زیادہ رکعتیں پڑھ لیں، وہ بھی للہ کے حکم میں داخل ہے ”لِلّٰہِ سَاجِدًا وَّ قَائِمًا“۔

(مظہری از بغوی)

پانچویں صفت: ”وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَھَنَّمَ اِنَّ عَذَابَھَا کَانَ غَرَامًا“ یعنی یہ مقبولینِ بارگاہ، شب و روز عبادت وطاعت میں مصروف رہنے کے باوجود بے خوف ہو کر نہیں بیٹھے رہتے، بلکہ ہر وقت خدا کا خوف اور آخرت کی فکر رکھتے ہیں، جس کے لئے عملی کوشش بھی جاری رہتی ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعائیں بھی۔

چھٹی صفت: ”وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَکَانَ بَیْنَ ذٰلِکَ قَوَامًا“ یعنی اللہ کے مقبول بندے مال خرچ کرنے کے وقت نہ اسراف اور فضول خرچی

کرتے ہیں اور نہ بخل و کوتاہی، بلکہ دونوں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "مِنْ فِقْهِ الرَّجُلِ قَصْدُهُ فِي مَعِيْشَتِهِ" یعنی انسان کی دانشمندی کی علامت یہ ہے کہ خرچ کرنے میں میانہ روی اختیار کرے۔

ساتویں صفت: "وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ" پہلی چھ صفات میں طاعت و فرمانبرداری کے اصول آ گئے ہیں، اب معصیت و نافرمانی کے اصولِ ممنوعہ کا بیان ہے، جن میں پہلی چیز عقیدہ سے متعلق ہے کہ یہ لوگ اللہ کے ساتھ کسی اور کو عبادت میں شریک نہیں کرتے۔ جس سے شرک کا سب سے بڑا گناہ ہونا معلوم ہوا۔

آٹھویں اور نویں صفت: "لَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ .... يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا" یہ عملی گناہوں میں سے بڑے اور سخت گناہوں کا بیان ہے کہ (اللہ کے مقبول بندے اُن کے پاس نہیں جاتے)، کسی کو ناحق قتل نہیں کرتے اور زنا کے پاس نہیں جاتے۔ یہ تین بڑے گناہ جو عقیدہ اور عملسے تعلق رکھتے ہیں ان کو بیان فرمانے کے بعد آیت میں ارشاد ہے "وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا"، یعنی جو شخص ان مذکورہ گناہوں کا مرتکب ہوگا وہ اس کی سزا پائے گا۔

آگے اُس عذاب کا بیان ہے جو جرائمِ مذکورہ کے کرنے والوں پر ہوگا اور آیات کے سیاق و سباق سے یہ بات متعین ہے کہ یہ عذاب ان کفار کے لئے مخصوص ہے جنہوں نے شرک و کفر بھی کیا اور اس کے ساتھ ساتھ قتل و زنا میں بھی مبتلا ہوئے۔

ان مسلمان گناہ گاروں کے لئے ان کے ایک گناہ پر ایک ہی سزا کا وعدہ قرآن و سنت میں منصوص ہے، سزا میں زیادتی مومنین کے لئے نہیں ہوگی۔ کوئی مومن ہمیشہ ہمیشہ عذاب میں نہیں رہے گا، مؤمن خواہ کتنا ہی بڑا گنہگار کیوں نہ ہو، اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد جہنم سے نکال لیا جائے گا۔

آگے یہ بیان ہے کہ ایسے سخت مجرم جن کا عذاب یہاں مذکور ہوا ہے، اگر وہ توبہ

کرلیں اور ایمان لا کر نیک عمل کرنے لگیں، تو اللہ تعالیٰ ان کے سیئات کو حسنات سے یعنی برائیوں کو بھلائیوں سے تبدیل کر دیں گے۔ ''اِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا. ...... وَمَنْ تَابَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا''

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ قفال رحمۃ اللہ علیہ سے یہ نقل کیا ہے کہ یہ توبہ پہلی توبہ سے مختلف ہے۔ کیونکہ پہلا معاملہ کفار و مشرکین کا تھا اور یہاں مسلمان گناہگاروں کا ذکر ہے۔ اسی لئے پہلی توبہ کے ساتھ ''وَاٰمَنَ'' یعنی اس کے ایمان لانے کا ذکر تھا۔ اس دوسری توبہ میں ''اٰمَنَ'' کی شرط مذکور نہیں، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ توبہ ان لوگوں کی ذکر کی گئی ہے جو پہلے ہی سے مومن تھے، مگر غفلت سے قتل و زنا میں مبتلا ہوگئے، تو ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی کہ ایسے لوگ اگر توبہ کر لینے کے بعد صرف زبانی توبہ پر اکتفا نہ کریں، بلکہ آئندہ کے لئے اپنے عمل کو بھی صالح اور درست بنالیں، تو ان کا توبہ کرنا صحیح اور دُرست سمجھا جائے گا۔ یعنی جس نے توبہ کرلی، پھر اپنے عمل سے بھی اس توبہ کا ثبوت دیا، تو وہ صحیح طور پر اللہ کی طرف رجوع کرنے والا سمجھا جائے گا اور اس کے سیئات کو حسنات سے بدل دیا جائے گا۔

دسویں صفت: ''وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ'' یہ لوگ جھوٹ اور باطل کی مجلسوں میں شریک نہیں ہوتے۔

سب سے بڑا جھوٹ اور باطل تو شرک و کفر ہے۔ اس کے بعد عام جھوٹ اور گناہ کے کام ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ: اس سے مراد مشرکین کی عیدیں اور میلے ہیں۔

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ اور محمد بن حنفیہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس سے مراد گانے بجانے کی محفلیں ہیں۔ ان اقوال میں کوئی اختلاف نہیں، اللہ کے نیک بندوں کو ایسی محفلوں سے پرہیز کرنا چاہیے، کیونکہ لغو و باطل کا بالقصد دیکھنا بھی اس کی شرکت

کے حکم میں ہے۔ (مظہری)

بعض مفسرین نے "یَشْهَدُوْنَ" کو شہادت بمعنی گواہی سے لیا ہے اور معنی اس آیت کے یہ قرار دیئے کہ یہ لوگ جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔

بخاری و مسلم میں حضرت انس رضی اللہ تعالی عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے جھوٹی گواہی کو اکبرالکبائر (کبیرہ گناہ) فرمایا ہے۔

گیارہویں صفت: "وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا کِرَامًا" یعنی اگر لغو اور بیہودہ مجلسوں پر کبھی ان کا اتفاقاً گزر ہو جائے، تو وہ سنجیدگی اور شرافت کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اتفاق سے ایک روز کسی بیہودہ اور لغو مجلس پر گزر ہوا تو وہ وہاں ٹھہرے نہیں، گزرتے چلے گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم ہوا تو فرمایا کہ ابن مسعود کریم ہو گئے اور یہ آیت تلاوت فرمائی۔ (ابن کثیر)

بارہویں صفت: "وَالَّذِیْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْهَا صُمًّا وَّ عُمْیَانًا" یعنی اِن مقبول بندوں کی یہ شان ہے کہ جب ان کو اللہ کی آیات اور آخرت کی یاد دلائی جاتی ہے، تو وہ ان آیات کی طرف اندھے بہروں کی طرح متوجہ نہیں ہوتے، بلکہ سمیع و بصیر انسان کی طرح ان میں غور کرتے ہیں۔ اور ان پر عمل کرتے ہیں۔

اس آیت میں دو چیزیں مذکور ہیں۔

ایک آیاتِ الٰہیہ پر گر پڑنا یعنی اہتمام کے ساتھ متوجہ ہونا۔ یہ تو امرِ محمود و مقصود اور بہت بڑی نیکی ہے۔

دوسرے یہ کہ اندھے بہروں کی طرح گرنا کہ قرآن کی آیات پر توجہ تو دیں، مگر ان پر عمل کرنے میں ایسا معاملہ کریں کہ گویا انہوں نے سنا اور دیکھا ہی نہیں یا آیاتِ

قرآن پر عمل بھی کریں، مگر ان کو تفسیرِ صحابہ اور تابعین رحمہ اللہ تعالیٰ کے خلاف اپنی رائے یا سنی سنائی باتوں کے تابع کر کے غلط عمل کریں۔ یہ بھی ایک طرح سے اندھے بہرے ہو کر گرنے ہی کے حکم میں ہے۔

احکامِ دین کا صرف مطالعہ کافی نہیں، بلکہ اسلاف کی تفسیر کے مطابق سمجھ کر عمل کرنا ضروری ہے

آیاتِ مذکورہ میں اس بات کی بھی مذمت ہے کہ آیاتِ الٰہیہ کی طرف توجہ بھی دیں اور عمل بھی کریں، مگر بے سمجھے اور بے بصیرتی کے ساتھ اپنی رائے سے جس طرح چاہیں عمل کرنے لگیں۔

علامہ ابنِ کثیر رحمہ اللہ تعالیٰ نے ابنِ عون سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے حضرت امام شعبی رحمہ اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ اگر میں کسی مجلس میں پہنچوں، جہاں لوگ سجدے میں پڑے ہوں اور مجھے معلوم نہیں کہ کیسا سجدہ ہے، تو کیا میں بھی ان کے ساتھ سجدہ میں شریک ہو جاؤں؟ حضرت شعبی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا نہیں۔ مومن کے لئے یہ درست نہیں ہے کہ بے سمجھے کسی کام میں لگ جائے، بلکہ اس پر لازم ہے کہ بصیرت کے ساتھ عمل کرے۔ جب تم نے وہ آیتِ سجدہ نہیں سنی، جس کی بنا پر یہ لوگ سجدہ کر رہے ہیں، اور تمہیں ان کے سجدے کی حقیقت بھی معلوم نہیں تو اس طرح ان کے ساتھ سجدے میں شریک ہونا جائز نہیں۔

دنیا میں کوئی معمولی سے معمولی فن بھی صرف کتاب کے مطالعہ سے سمجھ میں نہیں آ سکتا، جب تک کہ کسی ماہر استاد کی رہنمائی حاصل نہ ہو۔ اسی طرح قرآنِ کریم میں اپنی سوچ و فکر پر اعتماد کر کے عمل کرنا یہ بھی آیاتِ الٰہیہ پر اندھے بہرے ہو کر گرنے کے مفہوم میں شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صراطِ مستقیم کی توفیق بخشیں۔

تیرھویں صفت: ”وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا ھَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّیّٰتِنَا قُرَّۃَ اَعْیُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا.“ اس آیت میں اپنی اولاد اور ازواج کے لئے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا ہے کہ ان کو میرے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک بنا دے۔

آنکھوں کی ٹھنڈک بنانے سے مراد حضرت حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ کی تفسیر کے مطابق یہ ہے کہ ان کو اللہ کی طاعت میں مشغول دیکھے۔ یہی انسان کے لئے آنکھوں کی اصلی ٹھنڈک ہے۔ اور اگر ”آنکھوں کی ٹھنڈک میں“ اولاد اور ازواج کی ظاہری صحت و عافیت اور خوشحالی بھی شامل کی جائے تو وہ بھی درست ہے۔

یہاں دعا میں اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ کے مقبول بندے صرف اپنے نفس کی اصلاح اور اعمالِ صالحہ پر قناعت نہیں کرتے بلکہ اپنی اولاد اور بیویوں کی بھی اصلاح، اعمال و اخلاق کی فکر کرتے اور اس کے لئے کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اسی کوشش میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ان کی صلاحیت کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتا رہے۔

اس آیت کے اگلے جملے میں دعا کا یہ جز بھی ہے ”وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا.“ یعنی ہمیں متقی لوگوں کا امام اور پیشوا بنا دے۔

بعض علما نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ ہر شخص اپنے اہل و عیال کا قدرتی طور پر امام و پیشوا ہوتا ہی ہے، اس لئے اس دعا کا حاصل یہ ہوگیا کہ ہماری اولاد اور اہل و عیال کو متقی بنا دیجئے اور جب وہ متقی ہو جائیں گے، تو طبعی طور پر یہ شخص متقین کا امام و پیشوا کہلائے گا۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ یہاں اپنی بڑائی کی دعا نہیں، بلکہ اولاد و ازواج کے متقی بنانے کی دعا ہے یہاں تک ”عِبَادُ الرَّحْمٰنِ“ یعنی مومنین کاملین کی اہم صفات کا بیان ہوگیا۔ آگے ان کی جزا اور آخرت کے درجات کا ذکر ہے۔

﴿ اُولٰٓئِكَ یُجْزَوْنَ الْغُرْفَۃَ ﴾

غُرفہ کے لغوی معنی بالاخانہ کے ہیں۔ جنت میں مقربینِ خاص کے لئے ایسے **غُرفات** ہوں گے جو عام اہلِ جنت کو ایسے نظر آئیں گے جیسے زمین والے ستاروں کو

دیکھتے ہیں۔ (بخاری ومسلم)

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ جنت میں ایسے غُرفات ہوں گے، جن کا اندرونی حصہ باہر سے اور بیرونی حصہ اندر سے نظر آتا ہوگا۔ لوگوں نے پوچھا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ غرفات کن لوگوں کے لئے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اپنے کلام کو نرم اور پاک رکھے اور ہر مسلمان کو سلام کرے اور لوگوں کو کھانا کھلائے اور رات میں اس وقت تہجد کی نماز پڑھے جب لوگ سو رہے ہو۔ (مظہری)

"وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا" یعنی جنت کی دوسری نعمت کے ساتھ ان کو یہ اعزاز بھی حاصل ہوگا کہ فرشتے ان کو مبارک باد دیں گے اور سلام کریں گے۔

یہاں تک مومنین مخلصین کی خصوصی عادات واعمال اور ان کی جزا وثواب کا ذکر تھا۔ آخری آیت میں پھر کفار ومشرکین کو عذاب سے ڈرا کر سورۃ کو ختم کیا گیا ہے۔

"قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ" اللہ کے نزدیک تمہاری کوئی وقعت اور حیثیت نہ ہوتی اگر تمہاری طرف سے اللہ کو پکارنا اور عبادت کرنا نہ ہوتا۔ کیونکہ انسان کی تخلیق کا منشاء ہی یہ ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کرے۔

اس کے بعد کفار ومشرکین جو رسالت اور عبادت ہی کے مُنکر ہیں، ان کو خطاب ہے "فَقَدْ كَذَّبْتُمْ" یعنی تم نے تو سب چیزوں کو جھٹلا ہی دیا ہے، اب اللہ کے نزدیک تمہاری کوئی وقعت نہیں۔ "فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا" یعنی اب یہ تکذیب وکفر تمہارے گلے کا ہار بن چکے ہیں اور تمہارے ساتھ لگے رہیں گے، یہاں تک کہ جہنم کے دائمی عذاب میں مبتلا کر کے چھوڑیں گے۔ (ونعوذ باللہ من حال اھل النّار.)

(ماخوذ از معارف القرآن جلد ۶)

تعمیرِ سیرت کی اساس

(سورۂ مؤمنون کی روشنی میں)

قرآن کریم میں ارشاد ہے:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝
وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ
وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا
مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ
وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ
الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝﴾

(سورۂ مؤمنون: ۱،۱۱)

ترجمہ: ”(دونوں جہان میں) کامیاب ہوئے وہ مومن جو:

۱. اپنی نمازوں میں عاجزی کرنے والے ہیں۔
۲. اور وہ جو بیہودہ باتوں سے منہ پھیرنے والے ہیں۔
۳. اور وہ جو زکوٰۃ ادا کرنے والے ہیں۔
۴. اور وہ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔
۵. مگر اپنی بیویوں سے یا جن کے مالک ہوئے ان کے دائیں ہاتھ۔

٦ (کنیزوں سے) بے شک ان پر کوئی ملامت نہیں۔
٧ پس جو ان کے سوا چاہے تو وہی ہیں حد سے بڑھنے والے۔
٨ اور (کامیاب ہوئے وہ مومن) وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کی رعایت کرنے والے ہیں۔
٩ اور وہ جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔
١٠ یہی لوگ ہیں جو وارث ہوں گے۔
١١ جو میراث پائیں گے باغ ٹھنڈی چھاؤں کے وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔"

فضائل و خصوصیات سورۂ مؤمنون

مسند احمد میں فاروقِ اعظم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے، انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی نازل ہوتی تھی تو پاس والوں کے کان میں ایسی آواز ہوتی تھی جیسی شہد کی مکھیوں کی آواز ہوتی ہے۔ ایک روز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ایسی ہی آواز سنی گئی تو ہم ٹھہر گئے کہ تازہ آئی ہوئی وحی سن لیں۔ جب وحی کی خاص کیفیت سے فراغت ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قبلہ رُخ ہو کر بیٹھ گئے اور یہ دعا کرنے لگے "اَللّٰھُمَّ زِدْنَا وَلَا تَنْقُصْنَا وَاَکْرِمْنَا وَلَا تُھِنَّا وَاَعْطِنَا وَلَا تَحْرِمْنَا وَاٰثِرْنَا وَلَا تُوْثِرْ عَلَیْنَا وَارْضَ عَنَّا وَاَرْضِنَا." (یا اللہ ہمیں زیادہ دے، کم نہ کر اور ہماری عزت بڑھا، ذلیل نہ کر اور ہم پر بخشش فرما، محروم نہ کر اور ہمیں دوسروں پر ترجیح دے، ہم پر دوسروں کو ترجیح نہ دے اور ہم سے راضی ہو اور ہمیں بھی اپنی رضا سے راضی کر دے۔)

اس کے بعد فرمایا کہ مجھ پر اس وقت دس آیتیں ایسی نازل ہوئی ہیں کہ جو شخص ان پر پورا پورا عمل کرے تو وہ (سیدھا) جنت میں جائے گا، پھر یہ دس آیتیں جو اوپر لکھی گئی ہیں، پڑھ کر سنائی۔ (ابن کثیر)

فلاح کیا چیز ہے، کہاں اور کیسے ملتی ہے؟

"قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ" لفظ فلاح قرآن وسنت میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ اذان واقامت میں پانچ وقت ہر مسلمان کو فلاح کی طرف دعوت دی جاتی ہے۔

فلاح کے معنی یہ ہیں کہ ہر مراد حاصل ہو اور ہر تکلیف دور ہو۔ یہ لفظ جتنا مختصر ہے اتنا ہی جامع ہے۔ مطلب یہ ہے کہ فلاح سے زیادہ کوئی انسان کسی چیز کی خواہش کر ہی نہیں سکتا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ مکمل فلاح، (کہ ایک مراد بھی ایسی نہ رہے جو پوری نہ ہو اور ایک بھی تکلیف ایسی نہ رہے جو دور نہ ہو)، دنیا میں کسی بڑے سے بڑے انسان کے بس میں نہیں۔ چاہے دنیا کا سب سے بڑا بادشاہ ہفت اقلیم کا مالک ہو یا سب سے بڑا رسول اور پیغمبر ہو۔ اس دنیا میں کسی کے لئے یہ ممکن نہیں کہ کوئی چیز خلاف طبع پیش نہ آئے اور جو خواہش جس وقت دل میں پیدا ہو بلاتا خیر پوری ہوجائے۔ اگر اور بھی کچھ نہیں تو ہر نعمت کیلئے زوال اور فنا کا کھٹکا اور ہر تکلیف کے واقع ہوجانے کا خطرہ، اس سے کون خالی ہوسکتا ہے؟

اس سے معلوم ہوا کہ فلاحِ کامل تو ایسی چیز ہے جو اس دُنیا میں دستیاب نہیں ہوسکتی، کیونکہ دُنیا دارالتکلیف والمحنت ہے اور اس کی کسی چیز کو بقا وقرار نہیں۔ یہ متاعِ گرانمایہ ایک دوسرے عالم میں ملتی ہے، جس کا نام جنت ہے، وہ ہی ایسا ملک ہے جس میں انسان کی ہر مراد ہر وقت بلا انتظار حاصل ہوگی۔ جنت میں قدم رکھتے ہوئے ہر شخص یہ کہے گا کہ اب ہمارا غم دور ہوا۔

قرآنِ کریم نے سورۂ اعلیٰ میں جہاں فلاح حاصل کرنے کا یہ نسخہ بتلایا "قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی" کہ اپنے آپ کو گناہوں سے پاک کرے اس کے ساتھ یہ بھی اشارہ فرمایا کہ، کامل فلاح کی جگہ آخرت ہے۔ دُنیا سے دل لگانا طالبِ فلاح کا کام نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ کامل ومکمل فلاح تو صرف جنت ہی میں مل سکتی ہے، دُنیا اس کی

جگہ ہی نہیں۔ البتہ اکثر حالات کے اعتبار سے ''بامراد ہونا اور تکلیفوں سے نجات پانا'' دُنیا میں بھی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو عطا فرماتے ہیں۔

آیاتِ مذکورہ میں اللہ تعالیٰ نے فلاح پانے کا وعدہ ان مومنین سے کیا ہے، جن میں وہ سات صفات موجود ہوں جن کا ذکر ان آیات میں آیا ہے۔ یہ فلاح عام ہے، جس میں آخرت کی کامل فلاح بھی داخل ہے اور دنیا میں جس قدر فلاح حاصل ہونا ممکن ہے وہ بھی۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوسکتا ہے کہ دنیا میں فلاح تو بظاہر کفار فجار کا حصہ بنی ہوئی ہے اور ہر زمانے کے انبیاء اور ان کے بعد صلحائے اُمت عموماً تکلیفوں میں مبتلا رہے ہیں، مگر اس کا جواب ظاہر ہے کہ دنیا میں مکمل فلاح کا وعدہ نہیں، بلکہ کچھ نہ کچھ تکلیف تو یہاں پر صالح متقی کو بھی اور کافر فاجر کو بھی پیش آنا ناگزیر ہے۔

مومن کامل کے وہ سات اوصاف جن پر آیاتِ مذکورہ میں فلاحِ دُنیا و آخرت کا وعدہ ہے

سب سے پہلا وصف مومن ہونا ہے جو ایک بنیادی چیز ہے۔ اس کے علاوہ جو سات اوصاف ان آیات میں بیان کئے گئے ہیں، وہ یہ ہیں۔

پہلا وصف: نماز میں خشوع۔ خشوع کے لغوی معنی سکون کے ہیں، اصطلاح شرع میں خشوع یہ ہے کہ قلب میں بھی سکون ہو۔ یعنی غیر اللہ کے خیال کو قلب میں بالقصد حاضر نہ کرے اور اعضائے بدن میں بھی سکون ہو کہ عَبث اور فضول حرکتیں نہ کرے۔

(بیان القرآن)

''حدیث میں حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ نماز کے وقت اپنے بندے کی طرف برابر متوجہ رہتا ہے جب تک وہ دوسری طرف التفات نہ

کرے، جب وہ دوسری طرف التفات کرتا ہے یعنی گوشۂ چشم سے دیکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے رُخ پھیر لیتے ہیں۔''

(رواہ احمد والنسائی وابوداود وغیرہم۔ مظہری)

''نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا کہ اپنی نگاہ اس جگہ رکھو، جس جگہ سجدہ کرتے ہو اور یہ کہ نماز میں دائیں بائیں التفات نہ کرو۔''

نماز میں خشوع کا درجہ

امام غزالی وعلامہ قرطبی رحمہ اللہ تعالیٰ اور بعض دوسرے حضرات نے فرمایا کہ نماز میں خشوع فرض ہے، اگر پوری نماز خشوع کے بغیر گزر جائے تو نماز ادا ہی نہ ہوگی۔

حضرت ابودرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ سب سے پہلے جو چیز اس امت سے اٹھ جائے گی یعنی سلب ہوجائے گی وہ خشوع ہے، یہاں تک کہ قوم میں کوئی خاشع نظر نہ آئے گا۔

دوسرا وصف: مومن کا دوسرا وصف لغو سے پرہیز کرنا ہے۔ لغو کے معنی فضول کلام یا کام جس میں کوئی دینی یا دنیوی فائدہ نہ ہو۔ لغو کا اصل درجہ معصیت اور گناہ ہے، جس میں فائدہ دینی نہ ہونے کے ساتھ ساتھ دینی ضرر ونقصان ہو۔ اس سے پرہیز واجب ہے۔ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''انسان کا اسلام جب ہی اچھا ہوسکتا ہے کہ جب وہ بے فائدہ چیزوں کو چھوڑ دے۔'' اسی لئے اس آیت میں اس سے اعراض کرنے کو مومن کامل کی خاص صفت قرار دیا گیا ہے۔

تیسرا وصف: زکوٰۃ ہے۔ زکوٰۃ کے معنی لغت میں پاک کرنے کے ہیں۔ اصطلاح شرع میں مال کا ایک خاص حصہ کچھ شرائط کے ساتھ صدقہ کرنے کو زکوٰۃ کہا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم میں عام طور پر یہ لفظ اسی اصطلاحی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ زکوٰۃ سے

مراد تزکیہ نفس بھی ہے۔ یعنی اپنے نفس کو شرک، ریا، تکبر، حسد، بغض، حرص اور بخل جیسی گندی امراض سے اپنے آپ کو پاک کرنا۔ یہ سب چیزیں حرام اور گناہِ کبیرہ ہیں۔ نفس کو ان تمام چیزوں سے پاک کرنا فرض ہے۔

چوتھا وصف: شرمگاہوں کی حفاظت ہے۔ یعنی وہ لوگ جو اپنی بیویوں اور شرعی لونڈیوں کے علاوہ سب سے اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

پانچواں وصف: امانت کا حق ادا کرنا ہے۔ خواہ وہ حقوق اللہ سے متعلق ہوں یا حقوق العباد سے۔

حقوق اللہ سے متعلق امانات تمام شرعی فرائض و واجبات کا ادا کرنا اور تمام محرمات اور مکروہات سے پرہیز کرنا ہے۔

اور حقوق العباد سے متعلق امانات میں مالی امانت اور اس کے علاوہ اگر کسی نے کوئی راز کی بات کسی سے کہی، وہ بھی اس امانت میں داخل ہے۔ بغیر اِذنِ شرعی کسی کا راز ظاہر کرنا امانت میں خیانت ہے۔ مزدور اور ملازم کو جو کام سپرد کیا گیا اور اُس کے لئے جتنا وقت طے ہو گیا، اس وقت میں اس کام کو پورا کرنا اور مکمل وقت اسی کام میں لگانا بھی امانت ہے۔ کام کی چوری یا وقت کی چوری خیانت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ امانت کی حفاظت بڑا جامع لفظ ہے۔

چھٹا وصف: عہد پورا کرنا ہے۔ عہد ایک تو وہ معاہدہ ہے جو جانبین سے کسی معاملہ کے سلسلہ میں لازم قرار دیا جائے، اس کا پورا کرنا فرض اور اس کے خلاف کرنا دھوکا ہے، جو حرام ہے۔

عہد کا دوسرا معنی جس کو وعدہ کہتے ہیں اس کو پورا کرنا بھی شرعاً واجب ہے۔

حدیث میں ہے **العدۃَ دَین** یعنی وعدہ ایک قسم کا قرض ہے، بلا عذر شرعی اس کے خلاف کرنا گناہ ہے۔

ساتواں وصف: نماز پر محافظت ہے۔ نماز کی محافظت سے مراد اس کی پابندی

کرنا اور ہر نماز کو اس کے مستحب وقت میں ادا کرنا ہے۔ یہ بات قابل نظر ہے کہ ان سات اوصاف کو شروع بھی نماز سے کیا گیا اور ختم بھی نماز پر کیا گیا۔

غور کیا جائے تو ان سات اوصافِ مذکورہ میں حقوق اللہ، حقوق العباد اور اُن سے متعلق تمام احکام آ جاتے ہیں، جو شخص ان اوصاف کے ساتھ متصف ہو جائے اور اس پر زندگی بھر جمارہے وہ مومن کامل اور دنیا و آخرت کی فلاح کا مستحق ہے۔ اور ایسے ہی لوگ جنت کے وارث ہوں گے۔ واللہ اعلم

(تقریباً یہی مضمون سورۂ معارج کی آیت نمبر ۱۹ سے ۳۵ تک بھی ہے)۔

(معارف القرآن)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝﴾ (سورہ القصص: ۶۰)

ترجمہ: ”اور تم کو جو کچھ دیا گیا ہے وہ دنیوی زندگی کا سامان اور یہیں کی رونق ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ اس سے بدرجہا بہتر اور باقی رہنے والا ہے، سو کیا تم لوگ نہیں سمجھتے؟“

تین چیزوں کا حکم اور تین چیزوں کی ممانعت

قرآن کریم میں ارشاد باری ہے:

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

﴿اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ وَالۡاِحۡسَانِ وَاِیۡتَآیِٔ ذِی الۡقُرۡبٰی وَیَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡکَرِ وَالۡبَغۡیِ ۚ یَعِظُکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَذَکَّرُوۡنَ ۝ وَاَوۡفُوۡا بِعَہۡدِ اللّٰہِ اِذَا عٰہَدۡتُّمۡ وَلَا تَنۡقُضُوا الۡاَیۡمَانَ بَعۡدَ تَوۡکِیۡدِہَا وَقَدۡ جَعَلۡتُمُ اللّٰہَ عَلَیۡکُمۡ کَفِیۡلًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ یَعۡلَمُ مَا تَفۡعَلُوۡنَ ۝ وَلَا تَکُوۡنُوۡا کَالَّتِیۡ نَقَضَتۡ غَزۡلَہَا مِنۡۢ بَعۡدِ قُوَّۃٍ اَنۡکَاثًا ؕ تَتَّخِذُوۡنَ اَیۡمَانَکُمۡ دَخَلًۢا بَیۡنَکُمۡ اَنۡ تَکُوۡنَ اُمَّۃٌ ہِیَ اَرۡبٰی مِنۡ اُمَّۃٍ ؕ اِنَّمَا یَبۡلُوۡکُمُ اللّٰہُ بِہٖ ؕ وَلَیُبَیِّنَنَّ لَکُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ مَا کُنۡتُمۡ فِیۡہِ تَخۡتَلِفُوۡنَ ۝ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰہُ لَجَعَلَکُمۡ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّلٰکِنۡ یُّضِلُّ مَنۡ یَّشَآءُ وَیَہۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَلَتُسۡـَٔلُنَّ عَمَّا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ۝﴾

(سورہ نحل: ۹۰ تا ۹۳)

ترجمہ: ”اللہ حکم کرتا ہے انصاف کرنے کا اور بھلائی کرنے کا اور قرابت والوں کے دینے کا اور منع کرتا ہے بے حیائی سے اور نا معقول کام سے اور سرکشی سے اور تم کو سمجھاتا ہے تا کہ تم یاد رکھو۔ اور پورا کرو عہد اللہ کا جب آپس میں عہد کرو اور نہ توڑو قسموں کو پکا کرنے کے بعد اور تم نے کیا ہے اللہ کو اپنا ضامن، اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ اور مت رہو جیسے وہ عورت کہ توڑا اس نے اپنا سوت کاتا ہوا محنت کے بعد ٹکرے ٹکرے، کہ ٹھراؤ اپنی قسموں کو دخل دینے کا بہانہ ایک دوسرے میں اس واسطے کہ ایک

فرقہ ہو چڑھا ہوا دوسرے سے، یہ تو اللہ پرکھتا ہے تم کو اس سے، اور کھول دے گا اللہ تمہارے لئے قیامت کے دن وہ بات جس میں تم جھگڑ رہے تھے۔ اور اللہ چاہتا تو سب کو ایک ہی فرقہ کر دیتا لیکن راہ بھلاتا ہے جس کو چاہے اور سجھاتا ہے جس کو چاہے اور تم سے پوچھ ہوگی جو کام تم کرتے تھے۔"

یہ آیت قرآنِ کریم کی جامع ترین آیت ہے جس میں پوری اسلامی تعلیمات کو چند الفاظ میں سمو دیا گیا ہے۔ اسی لئے سلفِ صالحین کے عہد مبارک سے آج تک دستور چلا آ رہا ہے کہ جمعہ و عیدین کے خطبوں کے آخر میں یہ آیت تلاوت کی جاتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ قرآنِ کریم کی جامع ترین آیت سورۂ نحل کی یہ آیت ہے۔

تین چیزوں کا حکم اور تین چیزوں کی ممانعت

اس آیت میں حق تعالیٰ نے تین چیزوں کا حکم دیا ہے۔

۱ ...... عدل۔

۲ ...... احسان۔

۳ ...... اہل قرابت کو ان کا حق دینا۔

اور تین ہی چیزوں سے منع فرمایا ہے۔

۱ ...... فحش کام۔

۲ ...... ہر برا کام۔

۳ ...... ظلم و تعدی۔

ان چھ الفاظ کا شرعی مفہوم اور اس کی حدود کی تشریح یہ ہے:

"عدل"، اس لفظ کے اصلی اور لغوی معنی برابر کرنے کے ہیں، اسی کی مناسبت

سے حکام کا لوگوں کے نزاعی مقدمات میں انصاف کے ساتھ فیصلہ عدل کہلاتا ہے، قرآنِ کریم میں "اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ" کے الفاظ اسی معنی کے لئے آئے ہیں، اور اسی لحاظ سے افراط اور تفریط کے درمیان اعتدال کو بھی عدل کہا جاتا ہے، اور اسی کی مناسبت سے بعض ائمہ تفسیر نے اس جگہ لفظ "عَدْل" کی تفسیر ظاہر و باطن کی برابری سے کی ہے۔ یعنی جو قول یا فعل انسان کے ظاہری اعضاء سے سرزد ہو اور باطن میں بھی اسکا وہی اعتقاد اور حال ہو۔ اس کو عدل کہا جاتا ہے۔ اصل حقیقت یہی ہے کہ یہاں لفظ "عَدْل" اپنے عام معنی میں ہے۔

ابن عربی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لفظ "عَدْل" کے اصلی معنی برابری کرنے کے ہیں۔ پھر مختلف نسبتوں سے اس کا مفہوم مختلف ہو جاتا ہے۔

مثلاً عدل کا ایک مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنے نفس اور اپنے رب کے درمیان عدل کرے، یعنی اللہ تعالیٰ کے حق کو اپنے حظِ نفس پر اور اس کی رضا جوئی کو اپنی خواہشات پر مقدم جانے اور اس کے احکام کی تعمیل اور اس کی ممنوعات و محرمات سے مکمل اجتناب کرے۔

"عَدْل" کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ آدمی خود اپنے نفس کے ساتھ عدل کا معاملہ کرے۔ یعنی اپنے نفس کو ایسی تمام چیزوں سے بچائے، جس میں اس کی جسمانی یا روحانی ہلاکت ہو۔ اس کی ایسی خواہشات کو پورا نہ کرے جو اس کے لئے انجام کار مضر ہوں، اور قناعت و صبر سے کام لے، نفس پر بلا وجہ زیادہ بوجھ نہ ڈالے۔

"عَدْل" کا تیسرا مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنے نفس اور تمام مخلوقات کے درمیان عدل کا معاملہ کرے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ تمام مخلوقات کے ساتھ خیر خواہی اور ہمدردی کا معاملہ کرے، کسی ادنیٰ اور اعلیٰ معاملہ میں کسی سے خیانت نہ کرے، سب لوگوں کے لئے اپنے نفس سے انصاف کا مطالبہ کرے، کسی انسان کو اس کے قول و فعل سے ظاہراً یا باطناً کوئی ایذاء اور تکلیف نہ پہنچائے۔

اسی طرح ایک "عَدْل" یہ ہے کہ جب دو فریق اپنے کسی معاملہ کا محاکمہ اس کے پاس لائیں تو فیصلہ میں کسی کی طرف میلان کے بغیر حق کے مطابق فیصلہ کرے۔

اور ایک "عَدْل" یہ بھی ہے کہ ہر معاملہ میں افراط و تفریط کی راہوں کو چھوڑ کر میانہ روی اختیار کرے۔

امام رازی رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہی معنی اختیار کر کے فرمایا ہے کہ لفظ "عدل" میں عقیدہ کا اعتدال، عمل کا اعتدال، اخلاق کا اعتدال سب شامل ہیں۔ (بحر محیط)

اس سے معلوم ہوا کہ لفظ "عَدْل" تمام اعمال صالحہ و اخلاقِ حسنہ کی پابندی اور تمام برے اعمال و اخلاق سے اجتناب کو حاوی اور جامع ہے۔

"اَلْاِحْسَان"، اس لفظ کے لغوی معنی اچھا کرنے کے ہیں۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ فعل یا خلق و عادت کو اپنی ذات میں اچھا اور مکمل کرے۔ دوسرے یہ کہ کسی دوسرے شخص کے ساتھ اچھا سلوک اور عمدہ معاملہ کرے۔ دوسرے معنی کے لئے عربی زبان میں لفظ احسان کے ساتھ حرف اِلیٰ استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ ایک آیت میں "اَحْسِنْ كَمَا اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ" فرمایا ہے۔

امام قرطبی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آیت میں یہ لفظ اپنے عام مفہوم کے لئے مستعمل ہوا ہے، اس لئے احسان کی دونوں قسمیں اس میں شامل ہیں۔ پھر پہلی قسم کا احسان یعنی کسی کام کو اپنی ذات میں اچھا کرنا، یہ بھی عام ہے۔ عبادات کو اچھا کرنا، اعمال و اخلاق کو اچھا کرنا اور معاملات کو اچھا کرنا۔

حضرت جبرئیل علیہ السلام کی مشہور حدیث میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "احسان" کے جو معنی بیان فرمائے ہیں، وہ "احسان" عبادت کے لئے ہے۔ اس ارشاد کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم خدا تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو اور اگر استحضار کا یہ درجہ نصیب نہ ہو تو اتنی بات کا یقین تو ہر شخص کو ہونا ہی چاہئے کہ حق تعالیٰ اس کے عمل کو دیکھ رہے ہیں، کیونکہ یہ تو اسلامی عقیدہ کا اہم جُزء ہے

کہ حق تعالیٰ کے علم و بصر سے کائنات کا کوئی ذرّہ خارج نہیں رہ سکتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ دوسرا حکم اس آیت میں ''احسان'' کا آیا ہے۔ اس میں عبادت کا احسان حدیث کی تشریح کے مطابق بھی داخل ہے اور تمام اعمال، اخلاق و عادات کا احسان۔ یعنی ان کو مطلوبہ صورت کے مطابق بالکل صحیح و درست کرنا بھی داخل ہے، اور تمام مخلوقات کے ساتھ اچھا سلوک کرنا بھی داخل ہے، خواہ وہ مسلمان ہوں یا کافر، انسان ہوں یا حیوان۔

امام قرطبی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس شخص کے گھر میں اس کی بلّی کو اس کی خوراک اور ضروریات نہ ملیں اور جس کے پنجرے میں بند پرندوں کی پوری خبر گیری نہ ہوتی ہو، وہ کتنی ہی عبادت کرے محسنین میں شمار نہیں ہوگا۔

اس آیت میں اوّل عدل کا حکم دیا گیا پھر احسان کا۔

بعض ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ عدل تو یہ ہے کہ دوسرے کا حق پورا پورا اس کو دیدے اور اپنا حق پورا پورا وصول کرلے، نہ کم نہ زیادہ۔ اور اگر تمہیں کوئی تکلیف پہنچائے تو ٹھیک اتنی ہی تکلیف تم اس کو پہنچاؤ۔ نہ کم نہ زیادہ۔ اور احسان یہ ہے کہ دوسرے کو اس کے اصل حق سے زیادہ دو اور خود اپنے حق میں چشم پوشی سے کام لو، کہ کچھ کم ہو جائے تو بخوشی قبول کرلو۔ اسی طرح دوسرا کوئی تمہیں ہاتھ یا زبان سے ایذاء پہنچائے تو تم اس سے انتقام لینے کے بجائے نہ صرف یہ کہ اس کو معاف کردو، بلکہ برائی کا بدلہ بھلائی سے دو۔ اس طرح عدل کا حکم تو فرض و واجب کے درجہ میں ہوا اور احسان کا حکم نفلی اور تبرّع کے طور پر ہوا۔

''اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی''، تیسرا حکم جو اس آیت میں دیا گیا ہے وہ ''اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی'' ہے۔ ''اِیْتَا'' کے معنی اعطاء یعنی کوئی چیز دینے کے ہیں، اور لفظ ''قُرْبٰی'' کے معنی قرابت اور رشتہ داری کے ہیں۔ ''ذِی الْقُرْبٰی'' کے معنی رشتہ داری، ذی رحم۔ ''اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی'' کے معنی ہوئے رشتہ دار کو کچھ دینا۔ یہاں اس کی تصریح نہیں

فرمائی کہ کیا چیز دینا، لیکن ایک دوسری آیت میں اس کا مفعول مذکور ہے "فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ"، (یعنی دو رشتہ دار کو اس کا حق)۔ ظاہر یہی ہے کہ یہاں بھی یہی مفعول مراد ہے کہ رشتہ دار کو اس کا حق دیا جائے۔ اس حق میں رشتہ دار کو مال دیکر مالی خدمت کرنا بھی داخل ہے اور جسمانی خدمت بھی، بیمار پرسی اور خبر گیری بھی اس میں داخل ہے اور زبانی تسلی و ہمدردی کا اظہار بھی اور اگرچہ لفظ احسان میں رشتہ داروں کا حق ادا کرنا بھی داخل تھا، مگر اس کی زیادہ اہمیت بتلانے کے لئے علیحدہ بیان فرمایا گیا۔

یہ تین حکم ایجابی تھے، آگے تین ممانعت وحرمت کے احکام ہیں:

"وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ"، یعنی اللہ تعالیٰ منع کرتا ہے "فَحْشَاء" "مُنْکَرِ" اور "بَغْیِ" سے۔

"فَحْشَاء" یہ جمع ہے اور اس کا واحد فحش آتا ہے۔ فحش ایسے برے فعل یا قول کو کہا جاتا ہے جس کی برائی کھلی ہوئی اور واضح ہو، ہر شخص اُس کو برا سمجھے۔ اور منکر وہ قول وفعل ہے جس کے حرام و ناجائز ہونے پر اہلِ شرع کا اتفاق ہو۔ اس لئے اجتہادی اختلافات میں کسی جانب کو "مُنْکَرَ" نہیں کہا جاسکتا۔ اور لفظ "مُنْکَرَ" میں تمام گناہ ظاہری باطنی، عملی اور اخلاقی سب داخل ہیں۔

"بَغْیِ" کے اصلی معنی حد سے تجاوز کرنے کے ہیں۔ مراد اس سے ظلم وعدوان ہے۔

حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: کہ ظلم کے سوا کوئی گناہ ایسا نہیں جس کا بدلہ اور عذاب جلد دیا جاتا ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ ظلم پر آخرت کا عذابِ شدید تو ہونا ہی ہے، اس سے پہلے دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ ظالم کو سزا دے دیتے ہیں، اگرچہ وہ یہ نہ سمجھے کہ یہ فلاں ظلم کی سزا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مظلوم کی مدد کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

اس آیت نے جو چھ حکم ایجابی اور تحریمی دیئے ہیں، اگر غور کیا جائے تو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی مکمل فلاح کا نسخۂ اکسیر ہیں۔ رزقنا اللہ تعالیٰ اتباعه.

عہد شکنی حرام ہے

کسی سے عہد و معاہدہ کرنے کے بعد عہد شکنی کرنا بہت بڑا گناہ ہے، مگر اس کے توڑنے پر کوئی کفارہ مقرر نہیں، بلکہ آخرت کا عذاب ہے۔

حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''کہ قیامت کے روز عہد شکنی کرنے والے کی پشت پر ایک جھنڈا نصب کر دیا جائے گا، جو میدان حشر میں اس کی رسوائی کا سبب بنے گا۔''

اسی طرح جس کام کی قسم کھائی، اس کے خلاف کرنا گناہِ کبیرہ اور آخرت میں وبالِ عظیم ہے اور دنیا میں بھی اس کی خاص صورتوں میں کفارہ لازم ہوتا ہے۔ (قرطبی)

قرآن کریم میں ارشاد ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:

''اور تم اللہ کے عہد (یعنی جس عہد کے پورا کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اس کو) پورا کرو، جب کہ تم اس کو اپنے ذمہ کرلو۔ (تخصیصاً یہ کہ صراحۃً کسی کام کا ذمہ لے لیا اور تعمیماً یہ کہ ایمان لائے، تو تمام احکامِ واجبہ کی ذمہ داری اس کے ضمن میں آگئی)۔ اور قسموں کو مستحکم کرنے کے بعد ان کو مت توڑو حالانکہ تم اللہ تعالیٰ کو گواہ بھی بنا چکے ہو، بے شک اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے، جو کچھ تم کرتے ہو۔ اور تم اس (مکہ میں رہنے والی پاگل) عورت کے مشابہ مت بنو جس نے اپنا سوت کاتا اور بوٹی بوٹی کر کے نوچ ڈالا۔ اس کی طرح تم بھی اپنی قسموں کو بعد درستی کے توڑ کر ان کو آپس میں فساد ڈالنے کا ذریعہ بنانے لگو۔'' (سورۃ نحل: ۹۱ تا ۹۳)

''اَنْ تَکُوْنَ اُمَّۃٌ ھِیَ اَرْبٰی مِنْ اُمَّۃٍ'' اس آیت میں مسلمانوں کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ جس جماعت سے تمہارا معاہدہ ہو جائے، اس معاہدہ کو دُنیوی اغراض و منافع کے لئے نہ توڑو۔ مثلاً تمہیں یہ محسوس ہو کہ جس جماعت یا پارٹی سے معاہدہ ہوا ہے، یہ

کمزور اور تعداد میں قلیل ہے یا مال کے اعتبار سے مفلس ہے اور اس کے بالمقابل دوسری جماعت کثیر اور قوی ہے یا مال و دولت والی ہے، تو صرف اس طمع سے کہ قوی اور مالدار پارٹی میں شامل ہو جانے سے منافع زیادہ ہوگا، پہلی جماعت کا عہد توڑنا جائز نہیں، بلکہ اپنے عہد پر قائم رہے اور نفع وضرر کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دے۔

البتہ جس جماعت یا پارٹی سے عہد کیا ہے اگر وہ خلافِ شرع امور کا ارتکاب کرے اور کرائے تو اس عہد کا توڑ دینا واجب ہے بشرطیکہ واضح طور پر ان کو بتلا دیا جائے کہ اب ہم اس عہد کے پابند نہیں رہیں گے۔

آخر آیت میں مذکورہ صورتِ حال کو مسلمان کی آزمائش کا ذریعہ بتلایا گیا ہے، کہ حق تعالیٰ اس کا امتحان لیتے ہیں کہ یہ اپنے نفس کی اغراض وخواہشات کا تابع ہو کر عہد کو توڑ ڈالتا ہے یا اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں نفسانی جذبات کو قربان کرتا ہے۔

اور جن چیزوں میں تم اختلاف کرتے رہے (اور مختلف راہیں چلتے رہے) قیامت کے دن اُن سب کی حقیقت کو تمہارے سامنے اللہ تعالیٰ عملاً ظاہر کر دے گا۔ اور حق والوں کو جزاء اور باطل والوں کو سزا ہو جائے گی۔ اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو تم سب کو ایک ہی طریقہ کا بنا دیتا لیکن بمقتضائے حکمت اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں بے راہ کر دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں راہ پر ڈال دیتے ہیں۔ کسی کو یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ جیسے دُنیا میں گمراہوں کو پوری سزا نہیں ہوتی، ایسے ہی آخرت میں مطلق العنان رہیں گے۔ ہرگز نہیں، بلکہ قیامت میں تم سے تمہارے سب اعمال کی ضرور باز پرس ہوگی۔

(ماخوذ: معارف القرآن جلد ۵)

مسلمانوں کیلئے چند اہم وصیتیں

قرآن کریم میں ارشاد ہے:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۣ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ (سورۂ آل عمران:۲۰۰)

ترجمہ: ''اے ایمان والو صبر کرو اور مقابلہ میں مضبوط رہو اور لگے رہو اور ڈرتے رہو اللہ سے، تاکہ تم اپنی مراد کو پہنچو۔''

یہ سورۂ آل عمران کی آخری آیت ہے جو مسلمانوں کے لئے چند اہم وصیتوں پر مشتمل ہے، گویا یہ آیت پوری سورت کا خلاصہ ہے۔

اس آیت میں مسلمانوں کو تین چیزوں کی وصیت کی گئی ہے۔

۱ .....صبر،

۲ .....مصابرہ،

۳ .....مرابطہ،

اور چوتھی چیز تقویٰ ہے جو ان تینوں کے ساتھ لازم ہے۔

پہلی وصیت.....صبر

صبر کے لفظی معنی روکنے اور باندھنے کے ہیں اور اصطلاحِ قرآن وسنت میں نفس کو خلافِ طبع چیزوں پر جمائے رکھنے کو صبر کہا جاتا ہے، جس کی تین قسمیں ہیں۔

۱ ..... ''صبر عَلَى الطَّاعَات''، یعنی جن کاموں کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے، ان کی پابندی پر نفس کو جمائے رکھنا۔

❷ ...... "صَبْر عَنِ الْمَعَاصِیْ" یعنی جن گناہ کی چیزوں سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے، وہ نفس کے لئے چاہے کتنی ہی مرغوب اور لذیذ کیوں نہ ہو، ان سے نفس کو روکے رکھنا۔

❸ ...... "صبر عَلَی الْمَصَائب" یعنی مصیبت وتکلیف پر صبر کرنا، حد سے زیادہ پریشان نہ ہونا اور سب تکلیف وراحت کو حق تعالیٰ کی طرف سے سمجھ کر نفس کو بے قابو نہ ہونے دینا۔

دوسری وصیت......مصابرہ

مصابرہ جو کفار سے مقابلہ اور مقاتلہ کے وقت ہوتا ہے۔ مصابرت کے معنی ہیں دشمن کے مقابلہ میں ثابت قدم رہنا۔

تیسری وصیت......مرابطہ

مرابطہ جو کفار سے مقابلہ کا احتمال اور خطرہ لاحق ہونے کے وقت ہوتا ہے۔ مرابطہ کے معنی گھوڑے باندھنے اور جنگ کی تیاری کے ہیں۔ قرآن وحدیث میں یہ لفظ دو معنی کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

❶ ...... اسلامی سرحدوں کی حفاظت کے لئے جنگی گھوڑے اور جنگی سامان کے ساتھ مسلح رہنا لازمی ہے، تاکہ دشمن اسلامی سرحدوں کی طرف رُخ کرنے کی جرأت نہ کرے۔

❷ ...... نماز باجماعت کی ایسی پابندی کہ ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے انتظار میں رہے۔

یہ دونوں چیزیں اسلام میں بڑی مقبول عبادت ہیں، جن کے فضائل بے شمار ہیں۔

"صحیح مسلم میں مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”کہ ایک دن رات کا رَباط ایک مہینہ کے مسلسل روزے رکھنے اور تمام شب عبادت میں گزارنے سے بہتر ہے اور اگر اسی حال میں مرگیا تو اس کے عملِ رباط کا روزانہ ثواب ہمیشہ کے لئے جاری رہے گا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا رزق جاری رہے گا۔“

”امام ابوداؤد نے بروایت فضالہ بن عبید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ ہر مرنے والے کا عمل اس کی موت کے ساتھ ختم ہوجاتا ہے بجز مرابط کے، کہ اس کا عمل قیامت تک بڑھتا ہی رہتا ہے اور قبر میں حساب وکتاب سے مامون ومحفوظ رہتا ہے۔“

”ان روایات سے معلوم ہوا کہ عملِ رباط ہر صدقہ جاریہ سے بھی افضل ہے، کیونکہ صدقۂ جاریہ کا ثواب تو اسی وقت تک جاری رہتا ہے، جب تک اس کے صدقہ کئے ہوئے مکان، زمین یا تصانیفِ کتب یا وقف کی ہوئی کتابوں وغیرہ سے لوگ فائدہ اٹھاتے رہیں، جب یہ فائدہ منقطع ہوجائے تو ثواب بھی بند ہوجاتا ہے، مگر مرابط فی سبیل اللہ کا ثواب قیامت تک منقطع ہونے والا نہیں۔“

”وجہ یہ ہے کہ سب مسلمانوں کا اعمالِ صالحہ پر قائم رہنا، جب ہی ممکن ہے، جبکہ وہ دشمن کے حملوں سے محفوظ ہوں، تو ایک مرابط کا عمل تمام مسلمانوں کے اعمالِ صالحہ کا سبب بنتا ہے۔ اس لئے قیامت تک اس کے عملِ رباط کا ثواب بھی جاری رہے گا اور اس کے علاوہ جتنے نیک کام وہ دُنیا میں کیا کرتا تھا، ان کا ثواب بھی بغیر عمل کئے ہمیشہ جاری رہے گا۔“

”حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ مسلمانوں کی کمزور سرحد کی ایک دن اخلاص کے ساتھ حفاظت کرنا رمضان کے علاوہ دوسرے دنوں میں سو

سال مسلسل روزہ رکھنے اور قیام سے افضل ہے اور رمضان میں ایک دن کا رباط ایک ہزار سال کے صیام و قیام سے اعلیٰ اور افضل ہے۔ پھر فرمایا اور اگر اللہ تعالیٰ نے اس کو صحیح سالم اپنے اہل وعیال کی طرف لوٹا دیا تو ایک ہزار سال تک اس پر کوئی گناہ نہ لکھا جائے گا، برابر نیکیاں لکھی جاتی رہیں گی اور اس کے رباط کا عمل قیامت تک جاری رہے گا۔'' (قرطبی)

''نماز جماعت کی پابندی اور ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے انتظار میں رہنا بھی رباط فی سبیل اللہ ہے۔''

حضرت ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کہ میں تمہیں وہ چیزیں بتاتا ہوں جس سے اللہ تعالیٰ گناہوں کو معاف فرمادیں اور تمہارے درجات بلند کریں۔ وہ چیزیں یہ ہیں۔

۱ ...... وضو کو مکمل طور پر کرنا باوجودیکہ سردی یا کسی زخم، درد وغیرہ کے سبب اعضائے وضو کا دھونا مشکل نظر آرہا ہو۔

۲ ......اور مسجد کی طرف کثرت سے جانا۔

۳ ......ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار۔

پھر فرمایا ''ذٰلِکُمُ الرِّبَاط'' (یعنی یہی رباط فی سبیل اللہ ہے)

اور سب سے آخر میں تقویٰ کا حکم ہے جو ان سب کاموں کی روح اور جس پر تمام اعمال کی قبولیتِ کا مدار ہے۔

یہ آیت تقریباً تمام احکام شرعیہ پر حاوی ہے، حق تعالیٰ ہم سب کو ان احکام پر عمل کرنے کی کاملِ توفیق عطا فرمائیں اور ہمارے تمام اعمال حسنہ کو قبول فرمائیں۔

''وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ اَوَّلَہٗ وَاٰخِرَہٗ''

(معارف القرآن)

سماجی اور معاشرتی اقدار

قرآنِ کریم میں فرمانِ الٰہی ہے:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا ۝ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰـهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِىْ صَغِيْرًا ۝ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِىْ نُفُوْسِكُمْ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ۝﴾

(بنی اسرائیل: ۲۲ تا ۲۵)

ترجمہ: ”مت ٹھہرا اللہ کے ساتھ دوسرا حاکم۔ پس تو بیٹھ رہے گا مذمت کیا ہوا، بے بس ہو کر اور تیرے رب نے فرمایا کہ اُس کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو، اور ماں باپ سے حسن سلوک کرو، اور ان میں سے ایک یا وہ دونوں تیرے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں، تو انہیں نہ کہو اُف (بھی) اور انہیں نہ جھڑکو، اور ان سے ادب کے ساتھ بات کرو اور ان کے لئے عاجزی کے (ساتھ) بازو جھکا دو مہربانی سے، اور کہو اے میرے رب! ان دونوں پر رحم فرما، جیسے انہوں نے بچپن میں میری پرورش کی۔ تمہارا رب خوب جانتا ہے جو تمہارے دلوں میں ہے۔ اگر تم نیک ہو گے تو بیشک وہ رجوع کرنے والوں کو بخشنے والا ہے۔“

ربطِ آیات

سابقہ آیات میں قبولِ اعمال کے لئے چند شرائط کا بیان آیا ہے، جن میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ عمل وہی مقبول ہوسکتا ہے جو ایمان کے ساتھ ہو اور شریعت اور سنت کے مطابق ہو۔ ان آیات میں ایسے ہی خاص خاص اعمال کی ہدایت کی گئی ہے، جو شریعت کے بتلائے ہوئے احکام ہیں، ان کی تعمیل آخرت کی فلاح اور ان کی خلاف ورزی آخرت کی ہلاکت کا سبب ہے، اور چونکہ شرائطِ مذکورہ میں سب سے اہم شرط ایمان کی ہے، اس لئے سب سے پہلا حکم بھی توحید کا بیان فرمایا۔ اس کے بعد حقوق العباد سے متعلقہ احکام ہیں۔

حکم اول توحید

”لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا آخَرَ“

(مت ٹھہرا اللہ کے ساتھ دوسرا حاکم)

حکم دوم والدین کے حقوق کی ادائیگی

”وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا“

(اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو)

والدین کے ساتھ ادب واحترام اور اطاعت کی اہمیت

امام قرطبی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے والدین کے ادب واحترام اور اُن کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کو اپنی عبادت کے ساتھ ملا کر واجب فرمایا ہے۔ جیسا کہ سورۂ لقمان میں اپنے شکر کے ساتھ والدین کے شکر کو لازم فرمایا ہے۔ ”اَنِ اشْکُرْلِیْ وَلِوَالِدَیْکَ“ (یعنی میرا شکر ادا کرو اور اپنے والدین کا بھی) اس

سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ جل شانہٗ کی عبادت کے بعد والدین کی اطاعت سب سے اہم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے سوال کیا کہ ''اللہ کے نزدیک سب سے محبوب عمل کیا ہے؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''نماز اپنے وقت میں'' اس نے پھر دریافت کیا کہ ''اس کے بعد کون سا عمل سب سے زیادہ محبوب ہے؟'' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''والدین کے ساتھ اچھا سلوک۔'' (قرطبی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''جو شخص اللہ کے لئے ماں باپ کا فرمانبردار رہا اس کے لئے جنت کے دو دروازے کھلے رہیں گے اور جو ان کا نافرمان ہوا اس کے لئے جہنم کے دو دروازے کھلے رہیں گے اور اگر ماں باپ میں سے کوئی ایک ہی تھا تو ایک دروازہ جنت یا دوزخ کا کھلا رہے گا۔''

والدین پر شفقت کی ہر نظر کے بدلے ایک حج مقبول کا ثواب ملتا ہے۔

والدین کی حق تلفی کی سزا آخرت سے پہلے دنیا میں بھی ملتی ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: سب گناہوں کی سزا تو اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہتے ہیں، قیامت تک مؤخر کر دیتے ہیں بجز والدین کی حق تلفی اور نافرمانی کے کہ اس کی سزا آخرت سے پہلے دُنیا میں بھی دی جاتی ہے۔

(یہ سب روایات تفسیر مظہری سے نقل کی گئی ہیں)۔

مسئلہ: جب تک جہاد فرض عین نہ ہو جائے، اس وقت تک کسی لڑکے کے لئے والدین کی اجازت کے بغیر جہاد میں شریک ہونا جائز نہیں۔ ایک شخص نے بیان کیا کہ میں اپنے ماں باپ کو روتا ہوا چھوڑ کر آیا ہوں۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جاؤ ان کو ہنساؤ جیسا کہ ان کو رُلایا ہے۔''

مسئلہ: بقدرِ فرض علمِ دین جس کو حاصل ہو، وہ عالم بننے کے لئے یا لوگوں کو تبلیغ و

دعوت دینے کے لئے سفر کرے تو والدین کی اجازت کے بغیر جائز نہیں۔

مسئلہ: والدین کے انتقال کے بعد ان کے دوستوں اور رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کا برتاؤ کرنا چاہیئے۔

آیتِ مذکورہ میں خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک بنانے کا انجام بیان ہوا ہے۔ یعنی اگر خدا کے ساتھ اس کے حقوق میں کسی اور کو شریک بناؤ گے تو قیامت کے روز سزا وار مذمت ہو کر رہ جاؤ گے۔

اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ ہے کہ اس کے سوا تم کسی اور کی بندگی نہ کرو۔ خدا کے بعد سب سے پہلا حق والدین کا ہے اس لئے کہ وہ اس کی پیدائش اور پرورش کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اُن کے لئے بھی اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں قرار دیا کہ وہ اُس کی عبادت میں شریک ٹھہرائے جائیں اور بلکہ اُن کا حق یہ ہے کہ اُن کے ساتھ احسان اور نہایت بہتر سلوک کیا جائے۔

''اُف''، دل کی بیزاری کے اظہار کا کلمہ ہے اور ''نھر'' کے معنی ڈانٹنے اور جھڑکنے کے ہیں۔ اگر ماں باپ تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں، تو ان کے خلاف دل میں کوئی بیزاری پیدا نہ ہونے پائے اور نہ زبان سے کوئی کلمہ خلافِ ادب نکلے۔

سعادت مند اولاد تو اس بات کو یاد رکھتی ہے کہ جس طرح کبھی ایک گوشت کے لوتھڑے کی صورت میں مجھ کو اپنے والدین کی گود میں ڈالا گیا تھا، اسی طرح اب میرے والدین ہڈیوں کے ایک ڈھانچے کی صورت میں میرے حوالے کئے گئے ہیں اور میرا فرض ہے کہ میں ان کے احسان کا بدلہ احسان کی صورت میں دوں۔ لیکن ہر شخص اس بات کو یاد نہیں رکھتا۔ آگے ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِي صَغِيرًا ۞﴾

تمہارے والدین نے بچپن میں تمہیں اسی طرح اپنے بازوؤں کے نیچے چھپائے رکھا، جس طرح پرندہ اپنے بچے کو اپنے پروں کے نیچے چھپائے رکھتا ہے۔ اب اس کا حق یہ ہے کہ ان کے بڑھاپے میں تم بھی انہیں اپنی اطاعت و محبت کے بازوؤں کے نیچے چھپائے رکھو۔ یہ اطاعت و فرمانبرداری تمام تر محبت اور شفقت پر مبنی ہو، ان میں کسی اور جذبہ کو دخل نہ ہو۔

"وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا............الآیة" خدمت و محبت کے ساتھ ساتھ اُن کے لئے یہ دعا کرتے رہنے کی ہدایت ہوئی کہ اے میرے رب! جس طرح شفقت و محبت کے ساتھ انہوں نے بچپن میں مجھے پالا، اسی طرح اِس بڑھاپے میں اِن پر اپنی محبت و رحمت نازل فرما۔ یہ دعا والدین کا حق بھی ہے۔

والدین کی خدمت و اطاعت کسی زمانے اور کسی عمر کے ساتھ مقید نہیں۔ ہر حال اور ہر عمر میں والدین کے ساتھ اچھا سلوک واجب ہے۔

والدین کے بڑھاپے کا زمانہ، جبکہ وہ اولاد کی خدمت کے محتاج ہو جائیں اور ان کی زندگی اولاد کے رحم و کرم پر رہ جائے، اس وقت اگر اولاد کی طرف سے ذرا سی بے رخی بھی محسوس ہو تو وہ ان کے دل کا زخم بن جاتی ہے۔ دوسری طرف بڑھاپے کے عوارض طبعی طور پر انسان کو چڑچڑا بنا دیتے ہیں۔ بڑھاپے کے آخری دور میں جب عقل و فہم بھی جواب دینے لگتے ہیں، تو ان کی خواہشات و مطالبات کچھ ایسے بھی ہو جاتے ہیں، جن کا پورا کرنا اولاد کے لئے مشکل ہوتا ہے۔

قرآنِ حکیم نے ان حالات میں والدین کی دلجوئی اور راحت رسانی کے احکام دینے کے ساتھ ساتھ انسان کو اس کا زمانۂ طفولیت بھی یاد دلایا کہ کسی وقت تم بھی اپنے والدین کے اس سے زیادہ محتاج تھے، جس قدر آج وہ تمہارے محتاج ہیں۔ تو جس طرح انہوں نے اپنی راحت و خواہشات کو اُس وقت تم پر قربان کیا اور تمہاری بے عقلی کی باتوں کو پیار کے ساتھ برداشت کیا، اب جبکہ ان پر محتاجی کا یہ وقت آیا ہے، تو عقل

وشرافت کا تقاضا ہے کہ ان کے اُس سابق احسان کا بدلہ ادا کرو۔

آیت "كَمَا رَبَّيٰنِىْ صَغِيْرًا ۝" میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

﴿رَبُّكُمْ اَعْلَمُ .... غَفُوْرًا﴾

اگر والدین کی خدمت ومحبت میں ظاہری اطاعت نہ ہو اور یہ خدمت پاکیزہ جذبۂ محبت اور کامل سعادت مندی سے کی جائے، تو اللہ تعالیٰ دلوں کے حال سے خوب واقف ہے۔ اس خدمت کے ہوتے ہوئے اگر کوئی چھوٹی موٹی اتفاقیہ کوتاہی ہوجائے، تو اس کی تلافی توبہ اور رجوع الی اللہ سے ہوسکتی ہے، جو لوگ اپنی اس طرح کی کوتاہیوں پر برابر اللہ سے معافی مانگتے رہیں گے تو اللہ ان کو معاف کردے گا۔

لفظ اوابین بمعنی توابین ہے۔ حدیث میں بعد مغرب کی چھ رکعات اور اشراق کی نوافل کو صلوۃ الاوّابین کہا گیا ہے۔ جس میں اشارہ ہے کہ ان نمازوں کی توفیق انہیں لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو اوابین اور توابین ہیں۔ (معارف القرآن جلد۵)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿وَالَّذِيْنَ يَسْعَوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ۝﴾ (سورہ سبا:۳۸)

ترجمہ: "اور جو لوگ ہماری آیتوں کو نیچا دکھانے کے لئے کوشش کررہے ہیں، وہ عذاب میں پکڑے ہوئے لائے جائیں گے"

اپنی اور اپنے اہل وعیال کی اصلاح کی فکر کرنا

قرآنِ کریم میں ارشاد ہے:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ﴾ (سورۃ تحریم:۶)

ترجمہ: ''اے ایمان والو! تم اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے بچاؤ، جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں، اس پر تُند خو اور زور آور فرشتے معین ہیں، اللہ جو انہیں حکم دیتا ہے اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہ کرتے ہیں جو انہیں حکم دیا جاتا ہے۔''

اس آیت میں عام مسلمانوں کو حکم ہے کہ جہنم کی آگ سے اپنے آپ کو بھی بچائیں اور اپنے اہل وعیال کو بھی۔ پھر نارِ جہنم کی ہولناک شدت کا ذکر فرمایا اور آخر میں یہ بھی فرمایا کہ جو اس جہنم کا مستحق ہوگا، وہ کسی زور، طاقت، خوشامد یا رشوت کے ذریعہ ان فرشتوں کی گرفت سے نہیں بچ سکے گا، جو جہنم پر مسلط ہیں، جن کا نام زبانیہ ہے۔

لفظ ''اَهْلِيْكُمْ'' میں اہل وعیال یعنی بیوی، اولاد، غلام، باندیاں سب داخل ہیں، اور بعید نہیں کہ ہمہ وقتی نوکر چاکر بھی غلام باندیوں کے حکم میں ہوں۔

ایک روایت میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اپنے آپ کو جہنم سے بچانے

کی فکر تو سمجھ میں آگئی (کہ ہم گناہوں سے بچیں اور احکام الٰہیہ کی پابندی کریں) مگر اہل وعیال کو ہم کس طرح جہنم سے بچائیں؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو جن کاموں سے منع فرمایا ہے ان کاموں سے ان سب کو منع کرو اور جن کاموں کے کرنے کا تمہیں حکم دیا ہے، تم ان کے کرنے کا اہل وعیال کو بھی حکم دو تو یہ عمل ان کو جہنم کی آگ سے بچا سکے گا۔ (روح المعانی)

بیوی اور اولاد کی تعلیم وتربیت ہر مسلمان پر فرض ہے

حضراتِ فقہاء نے فرمایا کہ اس آیت سے ثابت ہوا کہ ہر شخص پر فرض ہے کہ اپنی بیوی اور اولاد کو فرائضِ شرعیہ اور حلال وحرام کے احکام کی تعلیم دے، اور اس پر عمل کروانے کی کوشش کرے۔

ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص پر اپنی رحمت نازل کرے جو کہتا ہے کہ ''اے میرے بیوی بچو! تمہاری نماز، تمہارا روزہ، تمہاری زکوٰۃ، تمہارا مسکین! تمہارا یتیم! تمہارے پڑوسی!'' امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو اس کے ساتھ جنت میں جمع فرمائیں گے۔

تمہاری نماز، تمہارا روزہ وغیرہ فرمانے کا مطلب ہے کہ ان سب کا خیال رکھو۔ اس میں غفلت نہ ہونے پائے۔

تمہارا یتیم تمہارے مسکین کا مطلب یہ ہے کہ ان کے حقوق جو تمہارے ذمہ ہیں ان کو خوشی اور پابندی سے ادا کرو۔

بعض بزرگوں نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن سب سے زیادہ عذاب میں وہ شخص ہوگا جس کے اہل وعیال دین سے جاہل وغافل ہوں۔

جب بھی دیکھے کہ اہل وعیال کے اندر اللہ کی شریعت سے بے پروائی راہ پا رہی

ہے تو فوراً اس کے سدّباب کی کوشش کرے۔ اس چیز کی پرواہ نہ کرے کہ یہ چیز ان کی طبیعت پر شاق گزرے گی۔ یہ ناگواری و بیزاری اس امر کے مقابل میں آسان ہے کہ آدمی ان کو جہنم میں جانے کے لئے چھوڑ دے۔

"وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ" کے الفاظ اس آگ کے مزاج کو ظاہر کر رہے ہیں کہ اس کی اصل غذا انسان اور پتھر بنیں گے۔ اسی ایندھن سے وہ اپنے اصلی رنگ میں بھڑکے گی۔

انسان سے مراد ظاہر ہے کہ وہ انسان ہیں، جنہوں نے اس دنیا میں اپنے آپ کو پاک نہیں کیا۔ بلکہ ان ہی گندگیوں اور نافرمانیوں میں لتھڑے رہے جن سے پاک کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی شریعت نازل فرمائی۔

"حِجَارَةُ" سے مراد بزرگوں کے نزدیک وہ پتھر مراد ہیں جو اس دنیا میں شرک و کفر اور عبادتِ غیرُ اللہ کی علامت کی حیثیت سے پوجے گئے۔

ان ہی چیزوں کو جلانے کیلئے یہ آگ پیدا کی گئی۔ تو جب یہ ایندھن اس کو ملے گا تو وہ "هَلْ مِنْ مَزِيْدٍ" کہتے ہوئے ایک ایک چیز کو نگلے گی اور جیسا کہ فرمایا ہے۔

"لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرْ" کسی چیز پر زرا بھی ترس نہ کھائے گی اور نہ کسی چیز کو چھوڑے گی۔

﴿عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ﴾

ترجمہ: "یعنی اس دوزخ پر جو فرشتے مقرر ہوں گے وہ نہایت دُرشت مزاج اور سخت گیر ہوں گے۔ کسی کے ساتھ ذرا بھی نرمی نہیں برتیں گے۔ ان کو جو حکم ملے گا اس کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔"

اس ٹکڑے میں ان لوگوں پر تعریض ہے جو اپنے اہل وعیال کی کسی بڑی سے بڑی غلطی پر بھی ان کو ٹوکنا محبت کے منافی سمجھتے ہیں۔ فرمایا کہ آج اگر ان کی محبت ان

کے احتساب سے تم کو روکے ہوئے ہے، تو یاد رکھو کہ دوزخ پر جو فرشتے مامور ہیں، وہ محبت کرنے والے نہیں، بلکہ بڑے ہی درشت مزاج اور سخت گیر ہوں گے۔ بہتر ہے کہ ان سے سابقہ پڑنے سے پہلے پہلے تم ہی اپنے احتساب سے اپنے آپ کو بھی اور اپنے اہل وعیال کو بھی جس حد تک عذاب کی گرفت سے بچانے کی کوشش کر سکتے ہو، کرلو۔

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَا تَعْتَذِرُوا الْیَوْمَ ؕ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ (سورۃ تحریم آیت ۷)

ترجمہ: "اے لوگو! جنہوں نے کفر کیا، آج عذر پیش نہ کرو، تم وہی بدلے میں پا رہے ہو جو تم کرتے رہے ہو۔"

عام مومنین کی نصیحت کے بعد کفار سے خطاب ہے کہ اب تمہارا کیا ہوا تمہارے سامنے آرہا ہے۔ اب کسی کا کوئی عذر قبول نہیں کیا جاسکتا۔ تمہارے سامنے جو کچھ آرہا ہے، تمہاری اپنی ہی بوئی ہوئی فصل کا پھل ہے یعنی دُنیا میں تم نے جو کمائی کی ہے، اب اس کے نتائج بھگتو۔ اس سے بچنے کے لئے تم جو کچھ کر سکتے تھے اب اس کا وقت گزر گیا۔

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ؕ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ یُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَ یُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰهُ النَّبِیَّ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ نُوْرُهُمْ یَسْعٰى بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ بِاَیْمَانِهِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَ اغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ ﴾ (سورہ تحریم آیت ۸)

ترجمہ: "اے ایمان والو! توبہ کرو اللہ کی طرف صاف دل کی توبہ۔ امید ہے تمہارا رب دور کر دے تم پر سے تمہاری برائیاں اور داخل کرے تم کو باغوں میں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں، جس دن کہ اللہ ذلیل نہ کرے گا

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اور ان لوگوں کو جو یقین لائے ہیں اس کے ساتھ، ان کی روشنی دوڑتی ہوگی ان کے آگے اور ان کے داہنے، کہتے ہوں گے اے رب! ہمارے پوری کر دے ہم کو ہماری روشنی اور معاف کر ہم کو بے شک تو سب کچھ کر سکتا ہے۔"

ان آیات میں دوزخ سے بچنے کا طریقہ بتلایا گیا ہے۔

اے ایمان والو! تم اللہ کے سامنے سچی توبہ کرو۔ یعنی دل میں گناہ پر کامل ندامت ہو اور آئندہ اس کے نہ کرنے کا پختہ قصد ہو۔

﴿تُوبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا﴾

توبہ کے لفظی معنی لوٹنے اور رجوع ہونے کے ہیں۔ لوٹنے اور رجوع ہونے سے مراد گناہوں سے لوٹنا ہے۔ اور اصطلاحِ قرآن وسنت میں توبہ اس کا نام ہے کہ انسان اپنے پچھلے گناہوں پر نادم ہو اور آئندہ اس کے پاس نہ جانے کا پختہ عزم کرے اور نصوح کو اگر مصدر نصح اور نصیحت سے لیا جائے تو اس کے معنی خالص کرنے کے ہیں اور اگر مصدر نصاحت سے مشتق قرار دیں، تو اس کے معنی کپڑے کو سینے اور جوڑ لگانے کے ہیں۔

پہلے معنی کے اعتبار سے نصوح کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ ریا اور نمود سے خالص ہو۔ محض اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور عذاب کے خوف سے گناہ پر نادم ہو کر اس کو چھوڑ دے۔ اور دوسرے معنی کے اعتبار سے نصوح اس مطلب کے لئے ہوگا کہ اعمالِ صالحہ کا لباس جو گناہ کی وجہ سے پھٹ گیا ہے تو یہ اُس کے پھٹن کو جوڑنے والی ہے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ توبۂ نصوح یہ ہے کہ انسان اپنے گزشتہ عمل پر نادم ہو اور پھر اس کی طرف نہ لوٹنے کا پختہ ارادہ اور عزم رکھتا ہو۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے سوال کیا گیا کہ توبہ کیا ہے؟ تو آپ رضی اللہ تعالی عنہ نے فرمایا جس میں چھ چیزیں جمع ہوں۔

۱ اپنے گزشتہ برے عمل پر ندامت۔

۲ جو فرائض و واجبات اللہ تعالیٰ کے چھوٹے ہیں، اُن کی قضا۔

۳ کسی کا مال وغیرہ ظلماً لیا تھا، تو اس کی واپسی۔

۴ کسی کو ہاتھ یا زبان سے ستایا اور تکلیف پہنچائی تھی، تو اس سے معافی۔

۵ آئندہ اس گناہ کے پاس نہ جانے کا پختہ عزم۔

۶ جس طرح اس نے اپنے نفس کو اللہ کی نافرمانی کرتے ہوئے دیکھا ہے، اب وہ اطاعت کرتے ہوئے دیکھ لے۔

﴿عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ﴾

ترجمہ: ''امید ہے تمہارا رب اُتار دے تم پر سے تمہاری برائیاں اور داخل کرے تم کو باغوں میں، جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں۔''

لفظ ''عَسٰی'' کا ترجمہ ''امید'' ہے اور یہاں مراد اس سے ''وعدہ'' ہے۔ مگر اس وعدہ کو بلفظ امید تعبیر کر کے اس طرف اشارہ کر دیا کہ توبہ ہو یا انسان کے دوسرے اعمالِ صالحہ ان میں سے کوئی بھی جنت و مغفرت کی قیمت نہیں اور نہ اللہ کے ذمہ از روئے انصاف یہ لازم آتا ہے کہ جو عملِ صالح کرے، اس کو ضرور جنت ہی میں داخل کرے۔ کیونکہ اعمالِ صالحہ کا ایک بدلہ تو ہر انسان کو دُنیوی زندگی میں عطا ہونے والی نعمتوں سے مل چکا ہے۔ اس کے بدلہ میں از روئے قانون و قاعدہ جنت ملنا ضروری نہیں۔ وہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل و انعام ہی پر موقوف ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے:

''کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں کسی کو صرف اس کا عمل نجات نہیں دلا سکتا۔ صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ہاں مجھے بھی'' جب تک کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و رحمت کا معاملہ نہ فرما دیں۔'' (بخاری و مسلم)

﴿يَوْمَ لَا يُخْزِى اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ﴾

ترجمہ: ”جس دن کہ اللہ ذلیل نہ کرے گا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اور ان لوگوں کو جو یقین لائے ہیں اس کے ساتھ۔“

فرمایا کہ اُس دن اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے با ایمان ساتھیوں کو رُسوا نہیں کرے گا۔ اس لئے کہ وہ اس دنیا ہی میں اپنے احتساب کے چھاج میں پھٹک کر، صرف ان لوگوں کو اپنی معیت کے لئے انتخاب کریں گے جو کفر و نفاق کی آلائش سے بالکل پاک ہوں گے۔ یہ ان لوگوں کی مانند نہیں ہوں گے، جنہوں نے خود بھی منافقانہ زندگی گزاری اور اپنے اہل وعیال اور دوسرے متعلقین کو بھی نفاق کی راہ دکھائی۔ یہ لوگ قیامت کے روز رُسوا ہوں گے، اس لئے کہ اُس روز اُن کو ان کے نفاق کی تاریکی گھیرے گی، جب کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے اصحاب اپنے ایمان واخلاص کی روشنی میں اپنی منزل کی طرف بڑھ رہے ہوں گے۔

﴿نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ بِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کی سُرخروئی اور سرفرازی کا بیان ہے کہ اُس دن سب اندھیرے میں بھٹک رہے ہوں گے، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں کے آگے اور داہنے ان کی روشنی ہوگی جو ان کی رہنمائی کر رہی ہوگی اور وہ دعا کرتے ہوں گے کہ اے ہمارے رب! ہماری روشنی کو کامل کر، ہماری مغفرت فرما، بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔

یہ روشنی ان لوگوں کو جنت میں داخل ہونے سے پہلے جنت کے راستے کو طے کرنے کے لئے دکھائی جائے گی، اس وجہ سے یہ لوگ گہرے جذبۂ شکر کے ساتھ یہ دعا کریں گے کہ اے رب! تو اس روشنی کو کامل کر اور ہماری مغفرت فرما۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ (معارف القرآن)

اشخاص و افراد کے باہمی حقوق اور ایذا رِسانی سے اِجتناب

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ۭ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝﴾

(سورۃ الحجرات:۱۱)

ترجمہ: ''اے ایمان والو ٹھٹھا نہ کریں ایک لوگ دوسرے سے شاید وہ بہتر ہوں ان سے اور نہ عورتیں دوسری عورتوں سے شاید وہ بہتر ہوں ان سے اور عیب نہ لگاؤ ایک دوسرے کو اور نام نہ ڈالو چڑانے کو ایک دوسرے کے برا نام ہے گنہگاری پیچھے ایمان کے اور جو کوئی توبہ نہ کرے تو وہی ہیں بے انصاف۔''

سابقہ دو آیتوں میں مسلمانوں کی اجتماعی و جماعتی اصلاح کے احکام بیان ہوئے، مذکور الصدر آیت میں اشخاص و افراد کے باہمی حقوق و آدابِ معاشرت کا ذکر ہے۔ ان میں تین چیزوں کی ممانعت فرمائی گئی ہے۔ اول کسی مسلمان کے ساتھ تمسخر و استہزا کرنا، دوسرے کسی پر طعنہ زنی کرنا، تیسرے کسی کو ایسے لقب سے ذکر کرنا جس سے اس کی توہین ہوتی ہو یا وہ اس سے برا مانتا ہو۔

پہلی چیز سخریہ یا تمسخر ہے۔ قرطبی نے فرمایا کہ کسی شخص کی تحقیر و توہین کے لئے اس کے کسی عیب کو اس طرح ذکر کرنا جس سے لوگ ہنسنے لگیں اس کو سخریہ۔ تمسخر۔ استہزاء کہا جاتا ہے اور یہ جیسے زبان سے ہوتا ہے ایسے ہی ہاتھ پاؤں وغیرہ سے اس کی نقل اتارنے یا اشارہ کرنے سے بھی ہوتا ہے اور اس طرح بھی کہ اس کا کلام سن کر بطور تحقیر کے ہنسی اڑائی جائے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ سخریہ و تمسخر کسی شخص کے سامنے اس کا ایسی طرح ذکر کرنا ہے کہ اُس سے لوگ ہنس پڑیں اور یہ سب چیزیں بنص قرآن حرام ہیں۔

سخریہ کی ممانعت کا قرآن کریم نے اتنا اہتمام فرمایا کہ اس میں مردوں کو الگ مخاطب فرمایا، عورتوں کو الگ، مردوں کو لفظ قوم سے تعبیر فرمایا، کیونکہ اصل میں یہ لفظ مردوں کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ اگرچہ مجازاً و توسعاً عورتوں کو اکثر شامل ہو جاتا ہے اور قرآنِ کریم نے عموماً لفظ قوم مردوں و عورتوں دونوں ہی کے لئے استعمال کیا ہے مگر یہاں لفظ قوم خاص طور سے مردوں کے لئے استعمال فرمایا اس کے بالمقابل عورتوں کا ذکر لفظ نساء سے فرمایا اور دونوں میں یہ ہدایت فرمائی کہ جو مرد کسی دوسرے مرد کے ساتھ استہزاء و تمسخر کرتا ہے اس کو کیا خبر ہے کہ شاید وہ اللہ کے نزدیک استہزاء کرنے والے سے بہتر ہو، اسی طرح جو عورت کسی دوسری عورت کے ساتھ استہزاء و تمسخر کا معاملہ کرتی ہے اس کو کیا خبر ہے شاید وہی اللہ کے نزدیک اس سے بہتر ہو۔ قرآن میں مردوں کا مردوں کے ساتھ اور عورتوں کا عورتوں کے ساتھ استہزاء کرنے اور اس کی حرمت کا ذکر فرمایا حالانکہ کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ یا کوئی عورت کسی مرد کے ساتھ استہزاء کرے تو وہ بھی اس حرمت میں داخل ہے مگر اس کا ذکر نہ کرنے سے اشارہ اس طرف ہے کہ عورتوں اور مردوں کا اختلاط ہی شرعاً ممنوع اور مذموم ہے جب اختلاط نہیں تو تمسخر کا تحقق ہی نہیں ہوگا۔ حاصل آیت کا یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے بدن یا صورت یا قد و قامت وغیرہ میں کوئی تمسخر کا کوئی عیب نظر آئے تو کسی کو اس پر ہنسنے یا

استہزاء کرنے کی جرأت نہ کرنا چاہئے کیونکہ اسے معلوم نہیں کہ شاید وہ اپنے صدق و اخلاص وغیرہ کے سبب اللہ کے نزدیک اس سے بہتر اور افضل ہو۔ اس آیت کو سن کر صالحین کا حال یہ ہوگیا تھا کہ عمرو بن شرحبیل نے فرمایا کہ میں اگر کسی شخص کو بکری کے تھنوں سے منہ لگا کر دودھ پیتے دیکھوں اور اس پر مجھے ہنسی آ جائے تو میں ڈرتا ہوں کہ کہیں میں بھی ایسا ہی نہ ہو جاؤں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میں اگر کسی کتے کے ساتھ بھی استہزاء کروں تو ڈرتا ہوں کہ میں خود کتا نہ بنا دیا جاؤں۔ (قرطبی)

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی صورتوں اور ان کے مال و دولت پر نظر نہیں فرماتا بلکہ ان کے قلوب اور اعمال کو دیکھتا ہے قرطبی نے فرمایا کہ اس حدیث سے ایک ضابطہ اور اصل یہ معلوم ہوئی کہ کسی شخص کے معاملہ میں اس کے ظاہری حال کو دیکھ کر کوئی قطعی حکم لگا دینا درست نہیں، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ جس شخص کے ظاہری حال اور اعمال و افعال کو ہم بہت اچھا سمجھ رہے ہیں، اللہ تعالیٰ جو اس کے باطنی حالات اور قلبی کیفیات کو جانتا ہے، وہ اس کے نزدیک مذموم ہو اور جس شخص کے ظاہری حال اور اعمال برے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے باطنی حالات اور قلبی کیفیات اس کے اعمالِ بد کا کفارہ بن جائیں۔ اس لئے جس شخص کو بری حالت یا برے اعمال میں مبتلا دیکھو تو اس کی اس حالت کو برا سمجھو مگر اس شخص کو حقیر ذلیل سمجھنے کی اجازت نہیں۔ دوسری چیز جس کی ممانعت اس آیت میں کی گئی ہے۔ وہ "لمزْ" ہے۔ "لمزْ" کے معنی کسی میں عیب نکالنے اور عیب ظاہر کرنے یا عیب پر طعنہ زنی کرنے کے ہیں آیت میں ارشاد فرمایا "لَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ" یعنی تم اپنے عیب نہ نکالو۔ یہ ارشاد ایسا ہی ہے جیسے قرآن کریم میں ہے "لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ" جس کے معنی یہ ہیں کہ تم اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔ دونوں جگہ اپنے آپ کو قتل کرنے یا اپنے عیب نکالنے سے مراد یہ ہے

کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو قتل نہ کرو، ایک دوسرے کو طعنہ نہ دو۔ اور اس عنوان سے تعبیر کرنے میں حکمت یہ بتلانا ہے کہ کسی دوسرے کو قتل کرنا ایک حیثیت سے اپنے آپ ہی کو قتل کرنا ہے کیونکہ اکثر تو ایسا واقع ہو ہی جاتا ہے کہ ایک نے دوسرے کو قتل کیا اور دوسرے کے حمایتی لوگوں نے اس کو قتل کر دیا، اور اگر یہ بھی نہ ہو تو اصل بات یہ ہے کہ مسلمان سب بھائی بھائی ہیں۔ اپنے بھائی کو قتل کرنا گویا خود اپنے کو قتل کرنا اور بے دست و پا بنانا ہے۔ یہی معنی یہاں "لَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ" میں ہیں کہ تم جو دوسروں کے عیب نکالو اور طعنہ دو تو یاد رکھو کہ عیب سے تو کوئی انسان عادۃً خالی نہیں ہوتا، تم اس کے عیب نکالو گے تو وہ تمہارے عیب نکالے گا جیسا کہ بعض علماء نے فرمایا کہ "وَفِيْكَ عُيُوْبٌ لِلنَّاسِ اَعْيُنٌ" یعنی تم میں بھی کچھ عیوب ہیں اور لوگوں کی آنکھیں ہیں جو ان کو دیکھتی ہیں۔ تم کسی کے عیب نکالو گے اور طعنہ زنی کرو گے تو وہ تم پر یہی عمل کریں گے اور بالفرض اگر اس نے صبر بھی کیا تو بات وہی ہے کہ اپنے ایک بھائی کی بدنامی اور تذلیل پر غور کریں تو اپنی ہی تذلیل و تحقیر ہے۔

علماء نے فرمایا ہے کہ انسان کی سعادت اور خوش نصیبی اس میں ہے کہ اپنے عیوب پر نظر رکھے، اُن کی اصلاح کی فکر میں لگا رہے اور جو ایسا کرے گا اس کو دوسروں کے عیب نکالنے اور بیان کرنے کی فرصت ہی نہ ملے گی۔ ہندوستان کے آخری مسلمان بادشاہ ظفر نے خوب فرمایا ہے ؎

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر، رہے دیکھتے اَوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پہ جو نظر، تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

تیسری چیز جس سے آیت میں ممانعت کی گئی ہے وہ کسی دوسرے کو برے لقب سے پکارنا ہے، جس سے وہ ناراض ہوتا ہو۔ جیسے کسی کو لنگڑا، لولا یا اندھا، کانا کہہ کر پکارنا یا اس لفظ سے اس کا ذکر کرنا۔ اسی طرح جو نام کسی شخص کی تحقیر کے لئے استعمال کیا جاتا ہو اُس نام سے اُس کو پکارنا۔ حضرت ابوجبیرہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے

فرمایا کہ یہ آیت ہمارے بارے میں نازل ہوئی ہے کیونکہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو ہم میں اکثر آدمی ایسے تھے جن کے دو یا تین نام مشہور تھے اور ان میں سے بعض نام ایسے تھے جو لوگوں نے اس کو عار دلانے اور تحقیر و توہین کے لئے مشہور کر دیئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم نہ تھا بعض اوقات وہی برا نام لے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو خطاب کرتے تو صحابہ عرض کرتے کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ اس نام سے ناراض ہوتا ہے اُس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ آیت میں تنابز بالالقاب سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص نے کوئی گناہ یا برا عمل کیا ہو اور پھر اس سے تائب ہو گیا ہو اس کے بعد اس کو اُس برے عمل کے نام سے پکارنا، مثلاً چور یا زانی یا شرابی وغیرہ۔ جس نے چوری، زنا، شراب سے توبہ کر لی ہو اس کو اس پچھلے عمل سے عار دلانا اور تحقیر کرنا حرام ہے۔ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص کسی مسلمان کو ایسے گناہ پر عار دلائے جس سے اس نے توبہ کر لی ہے تو اللہ نے اپنے ذمہ لے لیا ہے کہ اس کو اسی گناہ میں مبتلا کر کے دنیا و آخرت میں رسوا کرے گا۔ (قرطبی)

بعض القاب کا استثناء

بعض لوگوں کے ایسے نام مشہور ہو جاتے ہیں جو فی نفسہٖ برے ہیں مگر وہ بغیر اُس لفظ کے پہچانا ہی نہیں جاتا تو اس کو اس نام سے ذکر کرنے کی اجازت پر علماء کا اتفاق ہے بشرطیکہ ذکر کرنے والے کا قصد اس سے تحقیر و تذلیل کا نہ ہو، جیسے بعض محدثین کے نام کے ساتھ اعرج یا احدب مشہور ہے اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو جس کے ہاتھ نسبتاً زیادہ طویل تھے ذوالیدین کے نام سے تعبیر فرمایا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ سے دریافت کیا گیا کہ اسانیدِ حدیث میں بعض ناموں کے ساتھ کچھ ایسے القاب آتے ہیں مثلاً حمید الطّویل۔ سلیمان الاعمش۔ مروان

الاصفر وغیرہ، تو کیا ان القاب کے ساتھ ذکر کرنا جائز ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جب تمہارا قصد اس کا عیب بیان کرنے کا نہ ہو بلکہ اس کی پہچان پوری کرنے کا ہو تو جائز ہے۔ (قرطبی)

اچھے القاب سے یاد کیا جائے

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن کا حق دوسرے مومن پر یہ ہے کہ اس کا ایسے نام و لقب سے ذکر کرے جو اس کو زیادہ پسند ہو۔ اسی لئے عرب میں کنیت کا رواج عام تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کو پسند فرمایا۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص خاص صحابہ کو کچھ لقب دیئے ہیں۔ حضرت صدیقِ اکبر کو عتیق اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فاروق اور حضرت حمزہ کو اسد اللہ اور خالد بن ولید کو سیف اللہ فرمایا ہے۔ (معارف القرآن)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝﴾ (سورہ البقرہ: ۲۰۷)

ترجمہ: ”اور لوگوں میں ایک شخص وہ بھی ہے جو اللہ کی رضا جوئی میں اپنی جان تک صرف کر ڈالتا ہے اور اللہ ایسے بندوں کے حال پر نہایت مہربان ہے۔“

اللہ نرمی رکھتا ہے اپنے بندوں پر اور رزق دیتا ہے جس کو چاہے

قرآنِ کریم میں ارشاد ہے:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

﴿اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ۝ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ۝﴾

(سورۃ الشوریٰ: ۱۹، ۲۰)

ترجمہ: ''اللہ نرمی رکھتا ہے اپنے بندوں پر، رزق دیتا ہے جس کو چاہے، اور وہی ہے زور آور، زبردست۔ جو کوئی چاہتا ہو آخرت کی کھیتی، زیادہ کرتے ہیں ہم اس کے واسطے اس کی کھیتی، اور جو کوئی چاہتا ہو دنیا کی کھیتی، اس کو دے دیں گے ہم کچھ اس میں سے اور اس کے لئے نہیں آخرت میں کچھ حصہ۔''

''اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ''. لفظ ''لَطِيْفٌ'' لغت کے اعتبار سے چند معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہاں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کا ترجمہ ''حفی'' بمعنی ''مہربان'' سے اور حضرت عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ''بارّ'' یعنی ''محسن'' سے کیا ہے۔

حضرت مقاتل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے سبھی بندوں پر مہربان ہے۔ یہاں تک کہ کافر و فاجر پر بھی دنیا میں اس کی نعمتیں برستی ہیں۔ حق تعالیٰ

کی عنایات اور لطف وکرم اپنے بندوں پر بے شمار انواع و اقسام کے ہیں۔ اس لئے تفسیر قرطبی نے لفظ لطیف کے معنی بھی بہت سے بیان فرمائے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا رزق تو ساری مخلوقات کے لئے عام اور شامل ہے، دریا اور خشکی میں رہنے والے وہ جانور جن کو کوئی نہیں جانتا اس کا رزق ان کو بھی پہنچتا ہے۔ اس آیت میں جو یہ ارشاد فرمایا کہ رزق دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اس کا حاصل زیادہ واضح وہ ہے جس کو تفسیر مظہری نے اختیار کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رزق کی بے شمار اقسام و انواع ہیں۔ بقدرِ ضرورت رزق تو سب کے لئے عام ہے۔ پھر رزق کی تقسیم میں اپنی حکمتِ بالغہ سے مختلف درجات اور پیمانے رکھے ہیں۔ کسی کو مال و دولت کا رزق زیادہ دے دیا، کسی کو صحت وقوت کا، کسی کو علم و معرفت کا اور کسی کو دوسری انواع و اقسام کا۔ اس طرح ہر انسان دوسرے کا محتاج بھی رہتا ہے اور یہی احتیاج ان کو باہمی تعاون وتناصر پر آمادہ کرتی ہے، جس پر تمدنِ انسانی کی بنیاد ہے۔

حضرت جعفر بن محمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ رزق کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی رحمت و مہربانی بندوں پر دو طرح کی ہے۔

اول تو یہ کہ ہر ایک ذی روح کو اس کے مناسبِ حال غذا اور ضروریات عطا فرماتا ہے۔

دوسرے یہ کہ وہ کسی کو اس کا پورا رزق عمر بھر کا بیک وقت نہیں دیتا۔ ورنہ اول تو اس کی حفاظت کرنا مشکل ہو جاتا، اور کتنی بھی حفاظت کرتا وہ پھر بھی سڑنے اور خراب ہونے سے نہ بچتا۔ (مظہری و مثلہ فی القرطبی)

خلاصۂ تفسیر یہ ہے کہ جو لوگ دنیا کی ناز ونعمت پر مغرور ہو کر آخرت کو بھلا بیٹھے ہیں اور یہ سمجھتے اور کہتے ہیں کہ اگر ہمارا عمل اللہ کی رضا کے خلاف ہوتا تو ہم کو یہ عیش و عشرت کیوں دیتا؟

خوب سمجھ لیجئے کہ یہ ان کی بھول ہے، یہ دُنیا کی دولت ونعمت دلیلِ رضا نہیں

، بلکہ اس کی وجہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ (دنیا میں) اپنے بندوں پر (عام طور سے) مہربان ہے۔ (اسی رحمتِ عامہ کے سبب سب کو روزی دیتا ہے، صحت وتندرستی دیتا ہے جس میں مصالح وحکمت کی بنا پر کمی وبیشی بھی ہوتی ہے کہ) جس کو (جس قدر) چاہتا ہے روزی دیتا ہے (مگر نفسِ روزی سب میں مشترک ہے) اور (دنیا میں اس لطف و مہربانی سے یہ سمجھ لینا کہ ان کا طریقہ حق ہے اور آخرت میں لطف ومہربانی جاری رہے گی، سراسر دھوکہ ہے۔ وہاں تو ان کے اعمالِ بد پر عذاب ہوگا) وہ قوت والا زبردست ہے۔ (غرض ان کی ساری خرابیوں کی جڑ دنیا پر مغرور ہونا ہے۔ان کو چاہئے کہ اس سے باز آجائیں اور آخرت کی فکر کریں، کیونکہ جو شخص آخرت کی کھیتی کا طالب ہو، ہم اس کو اس کی کھیتی میں ترقی دیں گے۔ (اعمالِ صالحہ کھیتی ہے اور اس پر ملنے والا ثواب اس کا پھل ہے اور اس کی ترقی یہ ہے کہ ثواب مضاعف ملے گا، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ ایک نیکی کا بدلہ دس گنا ملے گا)۔ اور جو دنیا کی کھیتی کا طالب ہو (یعنی سارے عمل وسعی کا مقصد دنیا کی متاع ہو، آخرت کے لئے کچھ کوشش نہ کرے) تو ہم اس کو کچھ دنیا میں (اگر چاہیں) دے دیں گے اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں، (کیونکہ اس کی شرط ایمان ہے اور وہ ان میں ہے نہیں)۔ (معارف القرآن)

غفلت کا سبب
دنیا حاصل کرنے کی دھن

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۝ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۝ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۝ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ۝ ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ۝﴾ (سورۃ التکاثر)

ترجمہ: ''غفلت میں رکھا تم کو بہتایت کی حرص نے یہاں تک کہ جا دیکھیں قبریں کوئی نہیں آگے جان لو گے پھر بھی کوئی نہیں آگے جان لو گے کوئی نہیں اگر جانو تم یقین کر کے بے شک تم کو دیکھنا ہے دوزخ پھر دیکھنا ہے اس کو یقین کی آنکھ سے پھر پوچھیں گے تم سے اُس دن آرام کی حقیقت۔''

''اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ'' تکاثر کثرت سے مشتق ہے۔ معنی ہیں کثرت کے ساتھ مال و دولت جمع کرنا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حسن بصری نے اس لفظ کی یہی تفسیر کی ہے اور یہ لفظ بمعنی تفاخر بھی استعمال کیا جاتا ہے حضرت قتادہ کی یہی تفسیر ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ'' پڑھ کر فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ مال کو ناجائز طریقوں سے حاصل کیا جائے اور مال پر جو فرائض اللہ کے عائد ہوتے ہیں ان میں خرچ نہ کریں۔ (قرطبی)

”حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ“ یہاں زیارتِ مقابر سے مراد مرکر قبر میں پہنچنا ہے جیسا کہ حدیث مرفوع میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ”حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرُ“ کی تفسیر میں فرمایا ”حتی یأتیکم الموت“ (ابن کثیر بروایت ابن ابی حاتم)

اس لئے مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ تم لوگوں کو مال و دولت کی بہتات یا مال و اولاد اور قبیلہ ونسب پر تفاخر غفلت میں ڈالے رہتی ہے۔ اپنے انجام اور آخرت کے حساب کی کوئی فکر نہیں کرتے، یہاں تک کہ اسی حال میں تمہیں موت آجاتی ہے اور وہاں عذاب میں پکڑے جاتے ہو۔ یہ خطاب بظاہر عام انسانوں کو ہے جو مال واولاد کی محبت یا دوسروں پر اپنی برتری اور تفاخر میں ایسے مست رہتے ہیں کہ اپنے انجام کو سوچنے کی طرف توجہ ہی نہیں ہوتی۔ حضرت عبداللہ بن شخیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ”اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ“ پڑھ رہے تھے اور یہ فرمار ہے تھے کہ:

ترجمہ: ”آدمی کہتا ہے کہ میرا مال میرا مال حالانکہ اس میں تیرا حصہ تو اتنا ہی ہے جس کو تو نے کھا کر فنا کر دیا یا پہن کر بوسیدہ کر دیا یا صدقہ کر کے اپنے آگے بھیج دیا اور اس کے سوا جو کچھ ہے وہ تیرے ہاتھ سے جانے والا ہے تو اس کو لوگوں کے لئے چھوڑنے والا ہے۔“

(ابن کثیر وقرطبی بروایت مسلم، ترمذی، مسند احمد)

امام بخاری نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ترجمہ: ”اگر آدم زادے کے لئے ایک وادی (دامن کوہ) سونے سے بھری ہوئی موجود ہو تو (وہ اس پر قناعت نہیں کرے گا بلکہ) چاہے گا کہ ایسی دو وادیاں ہو جائیں اور اُس کے منہ کو تو (قبر کی) مٹی کے سوا کوئی چیز بھر نہیں سکتی اور اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرتا ہے اس شخص کی جو اس کی طرف

رجوع ہو۔“

حضرت اُبیؓ بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم حدیث کے الفاظ مذکورہ کو قرآن سمجھا کرتے تھے یہاں تک کہ سورۂ ”اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ“ نازل ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ”اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ“ پڑھ کر مذکورہ الفاظ اس کی تفسیر وتشریح کے طور پر پڑھے تھے۔ اس سے بعض صحابہ کو شبہ ہوگیا کہ یہ بھی قرآن ہی کے الفاظ ہیں۔ بعد میں جب پوری سورۃ الہاکم التکاثر سامنے آئی تو اس میں یہ الفاظ نہیں تھے اس سے حقیقت واضح ہوگئی کہ یہ الفاظ تفسیر کے تھے۔

”لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ“ حرف ”لَوْ“ جو شرط کے لئے آتا ہے اس کے مقابل کوئی جزاء ہونا چاہئے وہ بقرینہ سیاق اس جگہ حذف کر دی گئی ہے یعنی ”لما الھکم التکاثر“ یعنی اگر تم کو قیامت کے حساب کتاب کا یقین ہوتا تو تم اس تکاثر اور تغافل میں نہ پڑتے۔

”ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ“ اوپر خلاصۂ تفسیر سے معلوم ہو چکا ہے کہ عین الیقین سے مراد وہ یقین ہے کہ جو کسی چیز کے مشاہدہ کے بعد حاصل ہوتا ہے اور یہ سب سے اعلیٰ درجہ یقین کا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب کوہ طور پر تشریف رکھتے تھے اور ان کے پیچھے ان کی قوم نے گوسالہ پرستی شروع کر دی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو وہیں کوہ طور پر خبر کر دی تھی کہ تمہاری قوم اس وبال میں مبتلا ہوگئی ہے، مگر موسیٰ علیہ السلام پر اس خبر سے اتنا اثر نہیں ہوا جتنا اس وقت ہوا جب واپس پہنچ کر انھوں نے بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی آنکھوں سے دیکھی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ بے اختیار ہو کر الواحِ تورات ہاتھ سے چھوڑ دیں۔

(رواہ احمد والطبرانی بسند صحیح مظہری)

”ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ“ یعنی تم سب سے قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کے متعلق باز پرس ہوگی کہ تم نے ان کا شکر کیا ادا کیا؟ اور ان کو گناہوں

میں تو خرچ نہیں کیا، ان میں سے بعض نعمتوں کے متعلق تو خود قرآن میں دوسری جگہ وضاحت آ گئی جیسا فرمایا "اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا" جس میں انسان کی قوتِ شنوائی، بینائی اور دل سے متعلق وہ لاکھوں نعمتیں آ گئیں جن کو انسان ہر لمحہ استعمال کرتا ہے۔

حدیث

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز بندہ سے جس چیز کا سب سے پہلے سوال ہوگا (وہ تندرستی ہے) اس کو کہا جائے گا کہ کیا ہم نے تمہیں تندرستی نہیں دی تھی؟ اور کیا ہم نے تمہیں ٹھنڈا پانی نہیں پلایا تھا؟۔

(الترمذی عن ابی ہریرہ وابن حبان فی صیحہ ابن کثیر)

حدیث

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ محشر میں کوئی آدمی اپنی جگہ سے سرک نہ سکے گا جب تک پانچ سوالوں کا جواب اس سے نہ لیا جائے۔ ایک یہ کہ اس نے اپنی عمر کو کن کاموں میں فنا کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس نے اپنے شباب کی قوت کو کن کاموں میں خرچ کیا ہے۔ تیسرے یہ کہ جو مال اس نے حاصل کیا ہے وہ کس کس طریقے جائز یا ناجائز سے حال کیا ہے۔ چوتھے یہ کہ اس مال کو کہاں کہاں خرچ کیا، پانچویں یہ کہ جو علم اللہ نے اس کو دیا تھا اس پر کتنا عمل کیا۔ (رواہ البخاری)

اور امام تفسیر مجاہد نے فرمایا کہ قیامت میں یہ سوال دنیا کی ہر لذت کے متعلق ہوگا (قرطبی) خواہ اس کا تعلق کھانے پینے سے ہو یا لباس اور مکان سے یا بیوی اور اولاد سے یا حکومت وعزت سے۔ قرطبی نے اس کو نقل کر کے فرمایا کہ یہ بالکل درست ہے، اس سوال میں کسی خاص نعمت کی تخصیص نہیں ہے۔

سورۂ تکاثر کی خاص فضیلت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام سے خطاب کر کے فرمایا کہ کیا تم میں کوئی آدمی اس کی قدرت نہیں رکھتا کہ ہر روز قرآن کی ایک ہزار آیتیں پڑھا کرے۔ صحابۂ کرام نے عرض کیا کہ روزانہ ایک ہزار آیتیں کون پڑھ سکتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں کوئی "اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ" نہیں پڑھ سکتا، مطلب یہ ہے کہ "اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ" روزانہ پڑھنا ایک ہزار آیتوں کے پڑھنے کے برابر ہے۔

(مظہری بحوالہ حاکم وبیہقی عن ابن عمرؓ)

(معارف القرآن)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَا يَهْدِيْهِمُ اللّٰهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝﴾ (سورہ النحل:۱۰۴)

ترجمہ: "جو لوگ اللہ کی آیتوں پر ایمان نہیں لاتے، ان کو اللہ کبھی راہ پر نہیں لائے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔"

لوازمِ نجات

(سورۃ العصر کی روشنی میں)

قرآنِ کریم میں ارشاد ہے:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

﴿وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝﴾

ترجمہ: "عصر (زمانہ) کی قسم کہ انسان خسارے میں ہے، مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور (آپس میں) حق بات اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔"

سورۂ عصر کی خاص فضیلت

"حضرت عبید اللہ بن حصن رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے دو شخص ایسے تھے کہ جب وہ آپس میں ملتے تھے تو اُس وقت تک جدا نہ ہوتے تھے، جب تک ان میں سے ایک شخص سورۃ العصر نہ پڑھ لے۔" (رواہ الطبرانی)

سورۂ عصر قرآنِ کریم کی بہت مختصر سی سورت ہے، لیکن ایسی جامع ہے کہ بقول امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اگر لوگ اسی سورت کو غور و تدبر کے ساتھ پڑھ لیں، تو دین و دُنیا کی دُرستی کے لئے کافی ہو جائے۔

اس سورت میں حق تعالیٰ نے زمانہ کی قسم کھا کر فرمایا کہ نوعِ انسان بڑے

خسارے میں ہے اور اس خسارے سے مستثنیٰ صرف وہ لوگ ہیں جو چار چیزوں کے پابند ہوں۔

1. ایمان
2. عملِ صالح
3. دوسروں کو حق کی نصیحت و وصیت اور
4. صبر کی وصیت و تلقین

دین و دنیا کے خسارے سے بچنے اور نفعِ عظیم حاصل کرنے کا یہ قرآنی نسخہ چار اجزا سے مرکب ہے، جن میں پہلے دو جزء اپنی ذات کی اصلاح سے متعلق ہیں اور دوسرے دو جز دوسرے مسلمانوں کی ہدایت و اصلاح سے متعلق ہیں۔

یہاں پہلی بات یہ غور طلب ہے کہ اس مضمون کے ساتھ زمانے کو کیا مناسبت ہے، جس کی قسم کھائی گئی؟ عام حضراتِ مفسرین نے فرمایا کہ انسان کے تمام حالات، اس کا نشو ونما، اس کی حرکات و سکنات، اعمال، اخلاق سب زمانے ہی کے اندر ہوتے ہیں، جن اعمال کی ہدایت اس صورت میں دی گئی ہے، وہ بھی اسی زمانے کے لیل و نہار میں ہیں۔ اس کی مناسبت سے زمانہ کی قسم اختیار کی گئی۔

زمانے کو نوعِ انسانی کے خسارے میں کیا دخل ہے؟

انسان کی عمر کا زمانہ اس کے سال اور مہینے، دن اور رات، بلکہ گھنٹے اور منٹ ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو یہی اس کا سرمایہ ہے، جس کے ذریعہ وہ دنیا و آخرت کے منافع حاصل کرسکتا ہے اور عمر کے اوقات اگر غلط اور برے کاموں میں لگا دیئے تو یہی اس کے لئے وبالِ جان بھی بن جاتے ہیں۔

بعض علماء نے فرمایا کہ انسان کی زندگی چند گنے ہوئے سانسوں کا نام ہے، ان میں سے ایک سانس گزر جاتا ہے، تو اس کی عمر کا ایک جُزء کم ہوجاتا ہے۔

حق تعالیٰ نے ہر انسان کو اس کی عمر کے اوقاتِ عزیز کا بے بہا سرمایہ دے کر ایک تجارت پر لگایا ہے کہ وہ عقل و شعور سے کام لے اور اس سرمایہ کو خالص نفع بخش کاموں میں لگائے، اس کے منافع کی کوئی حد نہیں رہتی اور اس کے برخلاف اگر اپنے سرمایہ کو کسی غلط اور نقصان دِہ کام میں لگا دیا، تو نفع کی تو کیا امید ہوسکتی ہے، اس کی جمع پونجی بھی ضائع ہو جاتی ہے اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اس پر سینکڑوں جرائم کی سزا بھی عائد ہو جاتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿ كُلٌّ يَغْدُوْ فَبَائِعٌ نَفْسَهٗ فَمُعْتِقُهَا اَوْ مُوْبِقُهَا ﴾

ترجمہ: ''ہر شخص جب صبح اٹھتا ہے تو اپنی جان کا سرمایہ تجارت پر لگاتا ہے، پھر کوئی تو اپنے اس سرمایہ کو خسارہ سے آزاد کر لیتا ہے اور کوئی ہلاک کر ڈالتا ہے۔''

خود قرآنِ کریم نے بھی ایمان و عملِ صالح کو انسان کی تجارت کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔

﴿ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾

اور جب زمانۂ عمر انسان کا سرمایہ ہوا اور انسان اس کا تاجر تو عام حالات میں اس تاجر کا خسارہ میں ہونا، اس لئے واضح ہے کہ اس مسکین کا سرمایہ کوئی منجمد چیز نہیں کہ جس کو کچھ دن بیکار بھی رکھا، تو اگلے وقت میں کام آسکے گا، بلکہ یہ بہنے والا سرمایہ ہے، جو ہر منٹ، ہر سیکنڈ بہہ رہا ہے۔ اس کی تجارت کرنے والا بڑا ہوشیار اور مستعد آدمی ہونا چاہئے، جو بہتی ہوئی چیز سے نفع حاصل کر سکے۔

ایک بزرگ کا قول ہے کہ وہ برف بیچنے والے کی دکان پر گئے، تو فرمایا کہ اس کی تجارت کو دیکھ کر سورۂ والعصر کی تفسیر سمجھ میں آگئی کہ انسان ذرا بھی غفلت سے کام لے تو اس کا سرمایہ پانی بن کر ضائع ہو جائے گا۔ اس لئے اس ارشادِ قرآنی میں زمانہ کی قسم

کھا کر انسان کو اس پر متوجہ کیا ہے کہ خسارے سے بچنے کے لئے جو چار اجزاء سے مرکب نسخہ بتلایا گیا ہے، اس کے استعمال میں ذرا بھی غفلت نہ برتے۔ عمر کے ایک ایک منٹ کی قدر کرے اور ان چار کاموں میں اس کو مشغول کردے۔

اب ان چاروں اجزا کی تشریح یہ ہے کہ ایمان اور عمل صالح خود انسان کی ذات سے متعلق ہیں، ان کا معاملہ واضح ہے۔ کسی تشریح کا محتاج نہیں۔ البتہ آخری دو جزء یعنی "تواصی بالحق" اور "تواصی بالصبر" یہ قابلِ غور ہیں کہ ان سے کیا مراد ہے۔

لفظ تواصی وصیت سے مشتق ہے۔ کسی شخص کو تاکید کے ساتھ موثر انداز میں نصیحت کرنے اور نیک کام کی ہدایت کا نام وصیت ہے۔ اسی وجہ سے مرنے والا جو اپنے بعد کے لئے کچھ ہدایات دیتا ہے، اس کو بھی وصیت کہا جاتا ہے۔

یہ دو جزء درحقیقت اسی وصیت کے دو باب ہیں۔ ایک حق کی وصیت، دوسرے صبر کی وصیت۔ حق سے مراد عقائدِ صحیحہ اور اعمالِ صالحہ کا مجموعہ ہو اور صبر کے معنی تمام گناہوں اور برے کاموں سے بچنا ہو، تو پہلے لفظ کا حاصل امر بالمعروف ہوگیا یعنی نیک کاموں کا حکم کرنا اور دوسرے کا حاصل نہی عن المنکر ہوگیا یعنی برے کاموں سے روکنا۔ اس مجموعہ کا حاصل پھر وہی ایمان اور عملِ صالح ہے، جس کو خود اختیار کرتا ہے، اس کی تاکید و نصیحت دوسروں کو کرنا بھی ضروری ہوا۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وصیتِ بالحق سے مراد دوسرے مسلمانوں کی علمی اصلاح ہے اور وصیتِ بالصبّر سے مراد عملی اصلاح۔

نجات کے لئے صرف اپنے عمل کی اصلاح کافی نہیں، بلکہ دوسرے مسلمانوں کی فکر بھی ضروری ہے

اس سورۃ نے مسلمانوں کو ایک بڑی ہدایت یہ دی ہے کہ ان کا صرف اپنے عمل کو

قرآن وسنت کے تابع کر لینا جتنا اہم اور ضروری ہے، اتنا ہی اہم یہ ہے کہ دوسرے مسلمانوں کو بھی ایمان اور عملِ صالح کی طرف بلانے کی مقدور بھر کوشش کرے، ورنہ صرف اپنا عمل نجات کے لئے کافی نہ ہوگا، خصوصاً اپنے اہل وعیال اور احباب و متعلقین کے اعمالِ سیئہ سے غفلت برتنا، اپنی نجات کا راستہ بند کرنے کے مترادف ہے، اگرچہ خود کیسے ہی اعمالِ صالحہ کا پابند ہو۔ اسی لئے قرآن وحدیث میں ہر مسلمان پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض کیا گیا ہے۔

اس معاملہ میں عام مسلمان تو کجا بلکہ بہت سے خواص تک اس غفلت میں مبتلا ہیں کہ خود عمل کرنے کو کافی سمجھ بیٹھے ہیں اور اپنی اولاد وعیال کچھ بھی کرتے رہیں ان کو اس کی فکر نہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس آیت پر عمل کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین۔

(ماخوذ۔ معارف القرآن)

﴿يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِينَ ﴿۱۵۳﴾﴾ (سورۃ بقرۃ:۱۵۳)

ترجمہ: ''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو مدد لو صبر اور نماز سے، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

بندوں کے حقوق

کا تحفظ اور آخرت میں جزا کا ملنا

(سورۃ المطفّفین کی روشنی میں)

فرمانِ الٰہی ہے:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ كَلَّا اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ ۝ وَمَآ اَدْرٰكَ مَا سِجِّيْنٌ ۝ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝ وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۝ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ۝ ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ ۝ ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۝ كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ۝ وَمَآ اَدْرٰكَ مَا عِلِّيُّوْنَ ۝ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۝ عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ۝ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ ۝ يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ۝

خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ؕ وَفِیْ ذٰلِكَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ۝ وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِیْمٍ ۝ عَیْنًا یَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَضْحَكُوْنَ ۝ وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ یَتَغَامَزُوْنَ ۝ وَاِذَا انْقَلَبُوْۤا اِلٰۤى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فٰكِهِیْنَ ۝ وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْۤا اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ ۝ وَمَاۤ اُرْسِلُوْا عَلَیْهِمْ حٰفِظِیْنَ ۝ فَالْیَوْمَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ یَضْحَكُوْنَ ۝ عَلَى الْاَرَآئِكِ یَنْظُرُوْنَ ۝ هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ۝ (سورۃ المطففین)

ترجمہ: ''اللہ کے نام سے جو بڑا ہی مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لئے بڑی خرابی ہے، جو لوگوں سے ناپ کر لیں تو پورا لیں، اور جب اُن کو ناپ کر یا تول کر دیں تو کم کر دیں۔ کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ یہ زندہ کر کے اٹھائے بھی جائیں گے ایک بڑے سخت دن میں، جس دن تمام آدمی ربُّ العٰلمین کے سامنے کھڑے ہوں گے؟

ہرگز نہیں بلاشبہ بدکاروں کا نامۂ اعمال سجین میں ہے، اور تجھے کیا معلوم کہ سجین کیا ہے؟ یہ ایک دفتر ہے لکھا ہوا، اُس دن (قیامت کے دن) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی۔ وہ لوگ جو انصاف کے دن کو جھٹلاتے ہیں اور اس کو کوئی نہیں جھٹلاتا سوائے اُس شخص کے جو حد سے گزرنے والا ہو، اور مجرم ہو جب اس کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو اگلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ ہرگز ایسا نہیں، بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ ان کے دلوں پر ان کے برے اعمال کا زنگ چڑھ گیا ہے۔ ہرگز ایسا نہیں۔ یہ لوگ اس دن اپنے رب کا دیدار کرنے سے روک دیئے جائیں گے۔ پھر وہ دوزخ میں داخل کر دیئے جائیں گے۔ پھر

ان سے کہا جائے گا کہ یہی ہے جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔ ہرگز ایسا نہیں نیک لوگوں کا اعمال نامہ علّیّین میں ہے۔ اور تمہیں کیا معلوم کہ علّیّین کیا ہے؟ یہ ایک لکھا ہوا دفتر ہے۔ مقرب فرشتے اس کی نگرانی کرتے ہیں۔ بلاشبہ نیک کام کرنے والے بڑی آسائش میں ہوں گے مسندوں پر بیٹھے ہوئے (جنت کی اُن نعمتوں کو) دیکھ رہے ہوں گے (جن کا وعدہ اُن سے دنیا میں کیا گیا تھا، تم ان کے چہروں کو دیکھ کر پہچان لو گے کہ اُن پر یہ رونق جنت کی نعمتوں کی وجہ سے ہے۔ اُن کو خاص شراب پلائی جائے گی، جس پر مہر لگی ہوئی ہوگی۔ مہر مشک کی ہوگی۔ یہی ہے وہ چیزیں جس کے حاصل کرنے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس شراب میں تسنیم کا پانی ملا ہوا ہوگا۔ یہ ایک چشمہ ہے جس کا پانی مقرب بندے پئیں گے۔ جو لوگ مجرم تھے، وہ ان لوگوں کی ہنسی اڑایا کرتے تھے، جو ایمان لائے ہیں اور جب ان کے پاس سے گزرتے تو آنکھوں سے اشارے کیا کرتے تھے اور جب لوٹ کر اپنے لوگوں میں جاتے، تو دل لگیاں کیا کرتے تھے اور جب مومنوں کو دیکھتے تو کہتے کہ یقیناً یہ لوگ گمراہ ہو گئے ہیں، حالانکہ یہ کافر، ان (مومنوں) پر نگران بنا کر نہیں بھیجے گئے ہیں۔ تو آج (قیامت کے دن) مومن کافروں پر ہنستے ہوں گے۔ وہ مسندوں پر بیٹھے دیکھ رہے ہوں گے کہ کیا کافروں کو ان کے کرتوتوں کا بدلہ مل گیا؟''

تشریح:

﴿وَيۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِيۡنَ ۝ الَّذِيۡنَ اِذَا اكۡتَالُوۡا عَلَى النَّاسِ يَسۡتَوۡفُوۡنَ ۝ وَاِذَا كَالُوۡهُمۡ اَوۡ وَّزَنُوۡهُمۡ يُخۡسِرُوۡنَ ۝ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓـئِكَ اَنَّهُمۡ مَّبۡعُوۡثُوۡنَ ۝ لِيَوۡمٍ عَظِيۡمٍ ۝ يَّوۡمَ يَقُوۡمُ النَّاسُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۝﴾

ترجمہ: ''ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لئے بڑی خرابی ہے، جو لوگوں سے ناپ کرلیں تو پورا لیں۔ اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں تو کم کر دیں۔ کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ یہ زندہ کر کے اٹھائے بھی جائیں گے، ایک بڑے سخت دن میں، جس دن تمام آدمی رب العامین کے سامنے کھڑے ہوں گے؟''

اسلام جس قسم کے انسان بنانا چاہتا ہے، اُس کے لئے وہ دو بنیادیں فراہم کرتا ہے۔ ان میں سے ایک کا تعلق خالق سے ہے اور دوسری کا تعلق مخلوق سے۔ جو شخص خالق کے حقوق پہچانے اور ان کے تقاضے پورے کرے اور مخلوق کے ساتھ اپنے معاملات کو درست کر لے، اسلام کی نظر میں وہی کامیاب ہے۔ بندوں کے حقوق کا تحفظ اسلامی تعلیمات میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سورۃ کی ان ابتدائی آیتوں میں ان حقوق کی حفاظت ہی کے لئے لین دین میں انصاف کرنے کی ہدایت دی گئی ہے۔

اسلام جس قسم کا سماج پیدا کرنا چاہتا ہے، اس کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ لوگوں کو اپنے حقوق سے زیادہ دوسروں کے حقوق کا نگراں بناتا ہے۔

اسلامی معاشرے میں اونچا مقام اسی شخص کا سمجھا جاتا ہے جو اپنے فرائض اور دوسروں کے حقوق کا پورا پورا لحاظ رکھے۔

ان آیتوں میں معاملات کی ایک عام خرابی کی طرف اشارہ کر کے اسی اہم خصوصیت کو ابھارا گیا ہے۔ جب کسی شخص کے اندر خود غرضی اور مادّی فائدوں کی محبت پیدا ہو جاتی ہے، تو وہ اپنے حقوق کا تو پورا پورا لحاظ رکھتا ہے، لیکن دوسروں کا حق مار لینے میں کوئی برائی نہیں سمجھتا۔ وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ فائدہ اس میں ہے کہ اپنے حقوق تو پورے وصول کئے جائیں، لیکن جب حقوق ادا کرنے کا وقت آئے، تو ان میں کمی کر لی جائے۔ اس کے نزدیک عقل مندی یہ ہوتی ہے کہ لینے کے باٹ اور ہوں اور دینے

کے باٹ اور۔ اس ذہنیت کے بارے میں فرمایا گیا کہ ایسے لوگوں کے لئے بڑی خرابی ہے۔

یہ خرابی دُنیا کی بھی ہے اور آخرت کی بھی۔ جس سوسائٹی میں لوگوں کی ذہنیت یہ ہوجائے کہ وہ دوسروں کے حق مار لینے کو اپنا فائدہ خیال کرنے لگیں، اس میں کوئی نظم کامیابی کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ آپس کا اعتماد ختم ہوجاتا ہے۔ تعلقات خراب ہوتے ہیں اور جب ہر شخص دوسرے سے بڑھ کر بے ایمانی اور بدمعاملگی کرنے پر تُل جاتا ہے، تو یہ برائی ہر قدم پر دوگنی اور چوگنی ہوتی چلی جاتی ہے، یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے، اس خرابی کا اثر کسی ایک شخص کی ذات تک محدود نہیں رہتا، بلکہ اس کی چھوت ایک سے دوسرے کو لگتی ہے اور رفتہ رفتہ پورا معاشرہ اس کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔

لین دین اور معاملات کی خرابی دراصل ایک بڑی ذہنی بیماری کی پہچان ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ لوگوں کی نظر میں مادّی فائدوں کی اہمیت بڑھ گئی ہے، آخرت کی خرابی تو ظاہر ہے۔ آخرت میں اللہ تعالیٰ کے انصاف کا تقاضا یہ ہوگا کہ جس نے بھی کسی کا کتنا حق مارا ہوگا وہ اسے دلایا جائے گا اور وہاں حقوق ادا کرنے کے لئے انسان کے پاس جو کچھ پونجی ہوگی، وہ اس کے وہ اچھے کام ہوں گے جو اس نے دنیا میں کئے ہوں گے۔

اب اس سے بڑھ کر اس انسان کے لئے اور خرابی کیا ہوسکتی ہے کہ جب نیکیاں کمانے کی مہلت ختم ہوچکی اور انسان خود ان نیکیوں کا سب سے زیادہ محتاج ہو، اُس وقت اُس سے اُس کا یہ قیمتی سہارا چھین لیا جائے اور اگر یہ سرمایہ ناکافی ہوجائے تو پھر جس کا حق مارا ہو، اس کی برائیاں اس پر لاد دی جائیں۔

ذرا اس بوڑھے بے کس کا تصوّر کیجئے جس کے پاس جوانی کے زمانے کی کمائی کا کچھ تھوڑا بہت سرمایہ موجود ہو، اب ہاتھ پیر جواب دے چکے ہوں، مزید کمانے کے لائق وہ بالکل نہ رہا ہو اور اُس کے سامنے اُس کی اپنی بے شمار ضرورتیں ہوں، ایسی

حالت میں اس کے تھوڑے سے سرمایہ کو بھی چھین کر دوسروں کو دے دیا جائے اس بوڑھے کے لئے اس سے بڑی بدنصیبی اور کیا ہوسکتی ہے؟

بڑا ہی کوتاہ نظر ہے وہ شخص جو کسی مادّی فائدے کے لئے دوسرے کا حق مارتا ہے، ناجائز طریقے پر دوسرے کا مال حاصل کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں فائدے میں رہا۔ یہی سب سے بڑی خرابی اور سب سے بڑی بدنصیبی ہے۔

معاملات میں خرابی، دوسروں کے حقوق مار لینا اور لین دین میں بے انصافی سے کام لینا، اس بات کی پہچان ہے کہ یا تو اس شخص کو آخرت کی جواب دہی کا بالکل یقین ہی نہیں ہے، اور اُسے یہ خیال ہی نہیں ہے کہ ایک دن اللہ کے سامنے بھی حاضر ہونا ہے اور زندگی کے ایک ایک کام کی جواب دہی کرنا ہے۔ یا پھر اس کا یہ عقیدہ اتنا کمزور ہو گیا ہے کہ زندگی پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑ رہا ہے۔ دونوں صورتیں خرابی کا باعث ہیں۔ اور اس خرابی کے ہوتے ہوئے اسلامی زندگی اور اسلامی کردار ہرگز وجود میں نہیں آ سکتا۔ جو لوگ اسلامی زندگی کی طرف دوسروں کو دعوت دیتے ہیں اور اللہ کے دین کو سربلند کرنا چاہتے ہیں، ان کے اندر اگر یہ برائی کسی معمولی درجے میں بھی موجود ہو، تو یقین رکھئے کہ اُن کی تمام آرزوؤں اور تمام کوششوں کے باوجود انہیں کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی۔ معاملات کی صفائی اور لین دین میں دیانت اور امانت وہ پیمانہ اور کسوٹی ہے، جس سے کسی شخص کے اندر کا انسان ناپا اور پرکھا جا سکتا ہے۔

زندگی کے میدان میں اُتر کر جب کوئی شخص بے لاگ اور بے غرض قسم کی دیانت اور امانت کا ثبوت دیتا ہے، تو ذہن مجبور ہوتا ہے کہ ایسے شخص کی بات پر غور کریں۔ وہ اُس کے عقیدوں کا وزن محسوس کرتے ہیں۔ اُس کے قول اور فعل کی یکسانیت سے متاثر ہوتے ہیں اور اُس کے مقابلے میں اپنے مقام کو کمزور اور نیچا محسوس کرتے ہیں۔ اس وقت مخاطبوں کے ذہن اس قابل ہوتے ہیں کہ ان کے اندر کسی نئے خیال کا بیج ڈالا جائے، تو وہ جڑ پکڑ لیتا ہے اور پھر ایمان و عمل کا ایک ایسا درخت وجود میں آ جاتا

ہے جسے نہ مال کا لالچ اکھاڑ سکتا ہے اور نہ جان کا خوف۔

﴿كَلَّا اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝ وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۝ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝﴾

ترجمہ: ”ہرگز نہیں بلاشبہ بدکاروں کا نامۂ اعمال سجین میں ہے اور تجھے کیا معلوم کہ سجین کیا ہے؟ یہ ایک دفتر ہے لکھا ہوا، اس دن (قیامت کے دن) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی۔ وہ لوگ جو انصاف کے دن کو جھٹلاتے ہیں، اور اس کو کوئی نہیں جھٹلاتا سوائے اس شخص کے جو حد سے گزرنے ولا اور مجرم ہو۔ جب اس کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں، تو کہتا ہے کہ یہ تو اگلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔“

معاملات کی خرابی اور لین دین میں بے انصافی کی اصل وجہ بتاتے ہوئے اس سے پہلی آیات میں ذہن کو آخرت کی طرف موڑ دیا گیا ہے اور صاف صاف کہہ دیا گیا ہے کہ اس خرابی کا اصل سبب آخرت کے انکار کے سوا اور کچھ نہیں۔ ان لوگوں نے جو یہ سمجھ رکھا ہے کہ جو کچھ کرنا ہے، کرلیں، آگے کچھ ہونے والا نہیں، تو یہ بات اس طرح نہیں ہے۔ انہوں نے جو کچھ سمجھ رکھا ہے، سب غلط اور بے بنیاد ہے۔ ہرگز ایسا نہیں ہوسکتا کہ ان کے گمان کے مطابق کوئی پوچھ گچھ نہ ہو۔ ہر شخص کا اعمال نامہ مرتب ہو رہا ہے، وہ جو کچھ کرتا ہے، اس کو ریکارڈ کرلیا جاتا ہے اور یہ سب ایک مخصوص دفتر میں محفوظ ہے جس کا نام سجین ہے۔ یہ دفتر اپنی نوعیت کے لحاظ سے صرف بدکاروں کے ریکارڈ کے لئے مخصوص کردیا گیا ہے۔ اس دفتر کی تفصیلی نوعیت اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جان سکتا۔ البتہ جو بات ہمیں بتائی گئی ہے، وہ بالکل واضح ہے۔ وہ یہ کہ نتیجے کے اعتبار سے تمام لوگ دو قسموں میں بانٹ دیئے جائیں گے۔ ایک اللہ تعالیٰ کے

فرمانبردار اور دوسرے اُس کے باغی۔ یہاں باغیوں کا تذکرہ ہے۔ فرماں برداروں کا ذکر آگے آرہا ہے۔

آج جو لوگ اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلا رہے ہیں، اُس کی اطاعت قبول کرنے کے لئے تیار نہیں اور آخرت کا انکار کر رہے ہیں، وہ شاید یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں اپنی اس روش کا خمیازہ کبھی نہ بھگتنا پڑے گا۔ لیکن یہ ممکن نہیں ...... انصاف کا تقاضا ہے کہ ایک دن ایسا آئے، جب ظالم اور مظلوم، اچھے اور برے، فرماں بردار اور مجرم چھانٹ کر الگ الگ کر دیئے جائیں اور اُنہیں ان کے کاموں کے مطابق سزا یا انعام ملے۔ یہی بات عقل میں بھی آتی ہے۔ اور اگر کوئی ذرا بھی غور کرے تو وہ کسی دلیل کی بنیاد پر اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کے باوجود لوگ انکار کر رہے ہیں۔ جس دن اس انکار کا نتیجہ سامنے آئے گا، تو وہ دن ان کے لئے بڑا ہی سخت ہوگا۔ ناکامی کھل کر سامنے آجائے گی اور سوائے خرابی کے ان کے لئے کچھ نہ ہوگا۔ آج یہ اس نجام سے بے خبر ہیں اور انکار کر رہے ہیں۔

اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے زندگی کی جو رَوِش اختیار کر رکھی ہے اس کے ماتحت انہیں انکار ہی کرنا چاہئے۔ یہ ظلم کرتے ہیں، دوسروں کا مال دباتے ہیں، نفس کے بندے ہیں، اخلاق اور انسانیت کی حدوں کو پار کر جاتے ہیں۔ بندگی کی حدوں سے آگے بڑھ کر خود دوسروں کے خدا بنتے ہیں۔ غرض یہ کہ ان کی پوری زندگی مجرمانہ حرکتوں اور گناہوں سے بھری ہوئی ہے۔ ایسی صورت میں یہ کس طرح اس کا اقرار کر سکتے ہیں کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا، جب انہیں ان کے کرتوتوں کا مزا چکھایا جائے گا؟ اس اقرار کا تو پہلا تقاضا یہی ہوگا کہ یہ اپنی روش بدلیں، اس کے لئے وہ تیار نہیں، اس لئے یہ انکار ہی کرتے ہیں اور انکار ہی کرتے رہیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اُن کے سامنے اللہ تعالیٰ کے احکام اور اُس کی ہدایات آتی ہیں، تو سنی ان سنی کر دیتے ہیں کہ ہم نے ایسی کہانیاں بہت سنی ہیں، یہ سب اگلے لوگوں کی باتیں ہیں، ان

میں کیا دھرا ہے۔

﴿ كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ۝ ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ ۝ ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۝ ﴾

ترجمہ: ''ہرگز ایسا نہیں۔ بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ اُن کے دلوں پر اُن کے برے اعمال کا زنگ چڑھ گیا ہے۔ ہرگز ایسا نہیں۔ یہ لوگ اس دن اپنے رب کا دیدار دیکھنے سے روک دیئے جائیں گے۔ پھر وہ دوزخ میں داخل کر دیئے جائیں گے۔ پھر ان سے کہا جائے گا کہ یہی ہے جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔''

یہ انکار کرنے والے قرآن کو اگلوں کے قصے بتاتے ہیں۔ کہ یہ تو کہانیاں ہم نے بہت سنی ہیں۔ لیکن وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں، یہ ان کے دل کی آواز نہیں ہے۔ انہوں نے عقل کی روشنی میں سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ نہیں کیا ہے۔ بلکہ بات یہ ہے کہ انہوں نے زندگی کی جو روش اختیار کر رکھی ہے، یہ اس کا نتیجہ ہے۔ غلط کام کرتے کرتے اور برائیوں، بدکاریوں، حرام خوریوں میں وقت گزارتے گزارتے ان کے دلوں پر زنگ چڑھ گئے ہیں۔ برائیاں ان کے خمیر میں رچ بس گئی ہیں۔ بھلی بات ان کے دلوں پر اثر ہی نہیں کرتی۔ اسی وجہ سے یہ کھلی کھلی باتیں ان کی سمجھ میں نہیں آتیں۔

برائی کا یہ خاصہ ہے کہ وہ دل کو بھلائی کی طرف مائل ہونے سے روک دیتی ہے، ہر غلط کام دل پر ایک سیاہ نشان بن کر اپنا اثر چھوڑ جاتا ہے، اب اگر توبہ اور اصلاح سے اس کا علاج کر لیا جائے، تو دل سے یہ سیاہی دور ہو جاتی ہے، لیکن اگر اس طرف سے غفلت برتی جائے، تو پھر انسان برائیوں پر برائیاں کرتا چلا جاتا ہے اور دل میں بھلائی قبول کرنے کی صلاحیت کم ہوتی چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آ جاتا ہے کہ دل بالکل سیاہ ہو جاتا ہے اور پھر اس کی بھلائی قبول کرنے کی صلاحیت بالکل ختم

ہو جاتی ہے۔ اسی لئے انسان کو کسی چھوٹی سے چھوٹی برائی کو بھی حقیر نہ سمجھنا چاہئے۔ اگر کوئی خطا ہو جائے تو فوراً اس کی اصلاح اور توبہ کی فکر کرنا چاہئے۔

یہی ایک صورت ایسی ہے کہ انسان اپنے دل کو اس زنگ سے محفوظ رکھ سکتا ہے، جو برے اعمال کے نتیجے میں دل پر آتا رہتا ہے۔

ایک طرف تو ان لوگوں کے یہ اعمال ہیں، صبح سے شام تک اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور اس کی بغاوت کے مشغلے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے کچھ آرزوئیں قائم کر رکھی ہیں، کچھ لوگوں سے امیدیں لگا رکھی ہیں اور اپنے انجام کی طرف سے اطمینان حاصل کرنے کے لئے بہت سے جھوٹے سہارے پکڑ رکھے ہیں، لیکن حقیقت کے اعتبار سے یہ سب کچھ بھی نہیں ہیں۔ اِن سے اُن کو کچھ بھی حاصل نہ ہوگا، آخرت میں اُن کا انجام سراسر ناکامی ہی ناکامی ہوگا۔ اس دن یہ اپنے رب کے دیدار سے محروم رکھے جائیں گے۔ اُس کی نعمتیں ان کے لئے نہ ہوں گی، بلکہ اس کے مقابلے میں اس کے عذاب سے دو چار ہوں گے۔ دوزخ ان کا ٹھکانا ہوگا اور اس وقت ان سے کہا جائے گا کہ لو، دیکھ لو یہی ہے وہ انجام جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔ آج سب حقیقتیں بالکل کھل کر سامنے آگئیں، آج تم کسی بات کا انکار کر ہی نہیں سکتے، آج تمہیں معلوم ہو گیا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری دعوت حق ہی حق تھی، رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ کہا تھا، سب سچ تھا۔ جن باتوں کی خبر دی تھی وہ سب آنکھوں کے سامنے آگئیں، لیکن اب کیا ہوسکتا ہے۔ عمل کی مہلت ختم ہو چکی، امتحان کا وقت گزر چکا۔ اب تو اپنے کئے کی سزا پانا ہے اور بس!

﴿ كَلَّا اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ ۝ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۝ عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ۝ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ ۝ يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ۝ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ۭ وَفِيْ ذٰلِكَ

فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ۝ وَمِزَاجُهُ مِنْ تَسْنِيْمٍ ۝ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ۝

ترجمہ: ’’ہرگز ایسا نہیں، نیک لوگوں کا اعمال نامہ علیین میں ہے اور تمہیں کیا معلوم کہ علیین کیا ہے؟ یہ ایک لکھا ہوا دفتر ہے۔ مقرب فرشتے اس کی نگرانی کرتے ہیں۔ بلاشبہ نیک کام کرنے والے بڑی آسائش اور آرام میں ہوں گے۔ مسندوں پر بیٹھے ہوئے (جنت کی ان نعمتوں کو) دیکھ رہے ہوں گے (جن کا وعدہ ان سے دنیا میں کیا گیا تھا، تم ان کے چہروں کو دیکھ کر پہچان لو گے کہ ان پر یہ رونق جنت کی نعمتوں کی وجہ سے ہے۔ ان کو خالص شراب پلائی جائے گی، جس پر مہر لگی ہوئی ہوگی۔ مہر مشک کی ہوگی۔ یہی ہے وہ چیز جس کے حاصل کرنے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنا چاہیے...... اس شراب میں تسنیم کا پانی ملا ہوا ہوگا۔ یہ ایک چشمہ ہے جس کا پانی مقرب بندے پئیں گے۔‘‘

اب تک منکروں کے انجام کا ذکر تھا۔ اب اُن حالات کا مختصر اور موثر نقشہ پیش کیا جا رہا ہے جو اہلِ ایمان کو پیش آئیں گے۔ لیکن آگے بڑھنے سے پہلے صرف ایک لفظ ’’کَلَّا‘‘ کہہ کر منکروں کے ان تمام خیالات کو غلط ٹھہرا دیا ہے، جس میں وہ الجھے ہوئے تھے۔ مثلاً ان کا خیال تھا کہ اہلِ ایمان جس طرح اس دُنیا میں نعمتوں اور لذتوں سے محروم ہیں، اسی طرح آخرت میں بھی ان کے حصے میں کچھ نہ آئے گا، یا ان کا یہ خیال کہ زندگی بس یہی زندگی ہے، اِس کے بعد کچھ نہیں ہے۔ اس طرح اہلِ ایمان کے ساتھ وعدے کئے جا رہے ہیں، وہ سب غلط ہیں، انہیں کچھ نہ ملے گا، ایسے تمام غلط خیالات کی نفی کر دی گئی اور کہہ دیا گیا کہ ہرگز نہیں، تم نے جو کچھ سمجھ رکھا ہے، سب غلط ہے، آخرت کا آنا یقینی ہے، اور وہاں اہلِ ایمان کے ساتھ بالکل دوسری قسم کا معاملہ کیا جائے گا۔ پہلی بات تو یہی ہے کہ ان کے اعمال نامے منکروں کے اعمال سے

بالکل ممتاز ہوں گے۔ ان کا مقام علیین ہوگا۔ یہ ایک ایسا دفتر ہے جس کی نگرانی پر مقرّب فرشتے مامور کیئے گئے ہیں۔

عالمِ آخرت کی تقریباً تمام ہی باتیں ایسی ہیں جن کی اصل حقیقت سمجھ لینا، ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ وہ ایک ایسا عالم ہے جس کے اصول اور قاعدے اِس عالم سے بہت کچھ جدا ہیں۔ ہمارے حواس ان باتوں کو تو سمجھ سکتے ہیں، جن کا تجربہ وہ اس دُنیا میں کر سکتے ہیں اس دُنیا کی کچھ چیزوں سے اُن کی مثال تو دی جا سکتی ہے، لیکن اُنہیں پوری طرح سمجھایا نہیں جا سکتا۔

آخرت کے بارے میں قرآنِ پاک کی دی ہوئی تفصیلات کو پڑھتے وقت اس حقیقت کو ہمیشہ سامنے رکھنا چاہئے کہ علیین کیا ہے؟ اعمال نامے وہاں کس طرح رکھے جائیں گے؟ جنتیوں کے لئے تخت کس قسم کے ہوں گے؟ وہ کیا کیا دیکھ رہے ہوں گے؟ وہاں کی شراب کیسی ہوگی؟ مشک کی مہر سے کیا مطلب ہے؟ تسنیم کی حقیقت اور اُس کے پانی کی خصوصیت کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ، ساری باتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں سوچتے وقت اوپر بتائے ہوئے اصول کو سامنے رکھنا چاہئے اور ان الفاظ سے قرآنِ پاک جو تصوّر ذہنوں میں بٹھانا چاہتا ہے اور دلوں پر جو اثر ڈالنا چاہتا ہے، بس اسی کو کافی سمجھنا چاہئے۔ ان تفصیلات کی علمی تحقیق کرنے اور ان کی کھوج لگانے کی نہ کوئی ضرورت ہے اور نہ اس سے کوئی فائدہ۔

آخرت کی زندگی میں انسان دو گروہوں میں بٹ جائیں گے۔ ایک گروہ ناکام لوگوں کا ہوگا، اور دوسرا کامیاب لوگوں کا۔

اللہ پر ایمان لانے والے اور اس کے رسولوں کی اطاعت کرنے والے کامیاب ہوں گے، ان کی کامیابی کا راز یہ ہوگا کہ ان کا مالک ان سے خوش ہوگا اور اس کی تمام نعمتیں ان کے لئے ہوں گی۔ ان نعمتوں کا ایک تصور ذہن میں بٹھانے کے لئے بتایا گیا ہے کہ اگر اللہ کے دین پر چلنے کی خاطر لوگوں نے یہاں قسم قسم کی تکلیفیں اٹھائیں

ہیں، تو کیا بات ہے ایک دن ایسا بھی آنا ہے، جب ہر قسم کی نعمتیں ان ہی کے لئے ہوں گی۔ آج وہ ان نعمتوں کا صرف تصوّر کر سکتے ہیں، لیکن کل وہ انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی اور یہاں ان سے جو جو وعدے کئے گئے ہیں، وہ سب پورے کر دیئے جائیں گے۔ اِن نعمتوں کو پا کر اُن کے دل خوشی سے لبریز ہوں گے اور اس خوشی کے آثار ان کے چہروں سے ظاہر ہوں گے۔ اُن کے چہرے ہشاش بشاش ہوں گے اور اُن پر مسرت اور خوشی کی وجہ سے بڑی رونق ہوگی۔ اُن کے پینے کے لئے ایسے خالص مشروب ہوں گے، جن کی لذّت اور سرور کا کسی دوسری پینے والی چیز سے کوئی مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس مشروب کی تعریف کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اس میں تسنیم کا پانی بھی ملایا گیا ہوگا اور یہ جن ظروف میں جنتیوں کے سامنے پیش کیا جائے گا، ان پر مشک کی مہریں لگی ہوئی ہوں گی، اور تسنیم کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ جنت کا وہ مخصوص چشمہ ہوگا، جس کا پانی اللہ کے بندوں کو ہی پینے کے لئے دیا جائے گا، جیسا کہ اس سے پہلے کہا گیا ہے۔ تسنیم اور مشک کی ان مہروں کی اصل حقیقت سمجھ لینا تو ہمارے بس کی بات نہیں، اور نہ ان نعمتوں کا ذکر کر کے ہمیں ان کی حقیقت سمجھانا ہی مقصود ہے لیکن جو بات مطلوب ہے، وہ اس چھوٹے سے فقرے میں کہہ دی گئی ہے کہ "وَفِیْ ذَالِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ."

انسان دنیا کی لذتوں کو حاصل کرنے کے لئے دوڑ دھوپ کرتا ہے۔ نعمتوں کے حاصل کرنے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی راہیں تلاش کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ اس میدان میں جتنا آگے بڑھ جائے گا، اتنا ہی وہ کامیاب رہے گا۔

لیکن قرآن کریم جو نقطۂ نظر پیش کرتا ہے، وہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ دُنیا کی کوئی نعمت اپنی حقیقت کے اعتبار سے نعمت ہے ہی نہیں۔ یہاں جو کچھ ہے وہ آزمائش ہی آزمائش ہے۔ یہاں سختیوں اور مصیبتوں میں بھی انسان کا امتحان ہوتا ہے اور نعمتوں اور راحتوں میں بھی اس کی آزمائش ہوتی ہے۔ پھر

یہاں کی کوئی بڑی سے بڑی نعمت ایسی نہیں جسے فنا نہ ہو۔ نعمتیں اگر رہیں بھی تو انسانی زندگی کو بقا نہیں، لیکن اس کے برخلاف آخرت کی نعمتیں حقیقی نعمتیں ہیں، ان نعمتوں کو فنا نہیں، اور آخرت کی زندگی میں بھی ہمیشہ رہنے والی ہیں۔ پھر ان نعمتوں کو دے کر انسان کی آزمائش یا امتحان مقصود نہیں ہوگا۔ یہ نعمتیں سراسر انسان کی مسرتوں میں اضافہ ہی کرنے کے لئے دی جائیں گی، تو دراصل یہ ہیں وہ نعمتیں جن کے حاصل کرنے کے لئے انسان کو کوشش کرنا چاہئے۔ انسان حرص کرے تو ان نعمتوں کی کرے۔ دُنیا کی نعمتوں کی حرص کرنا اور اِن پر للچائی ہوئی نظریں ڈالنا تو ان لوگوں کا کام ہے جن کی نظریں صرف اسی دنیا کی زندگی تک جاتی ہیں اور جو اسی زندگی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں۔ جو لوگ زندگی کے اُس پار بھی حقیقتوں کو اپنی عقل اور سمجھ کی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں، اُن کی نظر میں تو نعمتیں وہی ہیں، جو آخرت میں ملنے والی ہیں۔

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَضْحَكُوْنَ ۝ وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ یَتَغَامَزُوْنَ ۝ وَاِذَا انْقَلَبُوْۤا اِلٰۤى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِیْنَ ۝ وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْۤا اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ ۝ وَمَاۤ اُرْسِلُوْا عَلَیْهِمْ حٰفِظِیْنَ ۝ فَالْیَوْمَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ یَضْحَكُوْنَ ۝ عَلَى الْاَرَآئِكِ یَنْظُرُوْنَ ۝ هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ۝﴾

ترجمہ: ”جو لوگ مجرم تھے، وہ ان لوگوں کی ہنسی اڑایا کرتے تھے، جو ایمان لائے ہیں اور جب اُن کے پاس سے گزرتے، تو آنکھوں سے اشارے کیا کرتے تھے اور جب لوٹ کر اپنے لوگوں میں جاتے، تو دل لگیاں کیا کرتے تھے اور جب مومنوں کو دیکھتے، تو کہتے کہ یقیناً یہ لوگ گمراہ ہو گئے ہیں، حالانکہ یہ (کافر) ان (مومنوں) پر نگراں بنا کر نہیں بھیجے گئے ہیں۔ تو آج (قیامت کے دن) مومن کافروں پر ہنستے ہوں گے، وہ مسندوں پر بیٹھے دیکھ رہے ہوں گے، کیا کافروں کو ان کے

کرتوتوں کا بدلہ مل گیا۔‘‘

نقطۂ نظر کے اختلاف سے بات میں بڑا فرق پڑ جاتا ہے۔ ایک ہی چیز ایک کی نظر میں اچھائی اور دوسرے کی نظر میں برائی ہو جاتی ہے۔ ایک ہی کام میں ایک شخص نفع سمجھتا ہے، لیکن دوسرا اسے سراسر نقصان جانتا ہے۔ یہی حال اُن لوگوں کا بھی ہے جن کا نقطۂ نظر اس زندگی کے بارے میں مختلف ہے۔ اِس دُنیا میں انسان کی حیثیت اور اِس کی اِس زندگی کے بارے میں عام طور پر دو طرح کے نقطۂ نظر پائے جاتے ہیں۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ انسان یہاں بالکل آزاد ہے، کوئی بالاتر ہستی ایسی نہیں جس کے سامنے انسان کو جواب دہی کرنا ہو اور موت کے ساتھ ہی انسان ہر حیثیت سے ختم ہو جاتا ہے، جو کچھ ہے موت تک ہے، اس کے بعد کچھ نہیں۔

اس کے برخلاف کچھ لوگوں کو یقین ہے کہ انسان بھی دُنیا کی تمام چیزوں کی طرح اللہ تعالیٰ کی ایک مخلوق ہے، اللہ ہی انسان کا رب ہے، زندگی یہی زندگی نہیں ہے، موت انسان کو ہمیشہ کے لئے ختم نہیں کر دیتی، بلکہ موت تو اُس زندگی میں داخل ہونے کا دروازہ ہے جو اِس زندگی کے بعد یقیناً آنی ہے اور جو ہمیشہ رہے گی۔ اُس زندگی میں انسان کو اپنے رب کے سامنے، اپنے تمام کاموں کی جواب دہی کرنا ہے اور اپنے اعمال کے لحاظ سے اچھا یا برا بدلہ پانا ہے۔

نقطۂ نظر کا یہ اختلاف اہم اختلاف ہے۔ اس اختلاف کی وجہ سے زندگی بالکل دو مختلف رنگوں میں رنگ جاتی ہے۔ اچھائی اور برائی کے پیمانے بدل جاتے ہیں، نفع اور نقصان کا مطلب کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔

ایک ہی کام ایک کی نظر میں نفع کا کام ہوتا ہے، لیکن دوسرا اُسے سراسر نقصان جانتا ہے۔

ایک کام ایک کی نظر میں عقل مندی اور ہوشیاری کا کام ہوتا ہے، لیکن دوسرا اسے

سراسر حماقت سمجھتا ہے، غرض یہ کہ دونوں کی پسند اور ناپسند اور دونوں کے مشاغل میں زمین و آسمان کا فرق ہو جاتا ہے۔ مثلاً بے ایمانی اور دھوکہ دے کر زیادہ سے زیادہ دولت جمع کر لینا اور نئی نئی ترکیبوں سے دوسروں کا مال اپنے قبضے میں لے آنا، ایک کے نزدیک عقل مندی اور ہوشیاری کا کام ہوتا ہے، لیکن دوسرا اسے بہت بڑا نقصان اور انتہائی بے وقوفی جانتا ہے۔

ایک کی نظر میں اپنی صلاحیتوں کا بہترین مصرف یہ ہوتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ دولت کمائے اور بڑے سے بڑے اقتدار پر قبضہ کر لے، لیکن دوسرا اپنی تمام قوتوں کو نیکی پھیلانے اور دوسروں کی خدمت کرنے میں لگا دیتا ہے اور اُسے یقین ہوتا ہے کہ اُس نے بڑے نفع کا سودا کیا ہے۔ اسی صورت حال کا ایک نقشہ اِن آیتوں میں پیش کیا گیا ہے۔

ایک طرف اللہ کے وہ بندے ہیں، جنھوں نے خدا اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اطاعت کا اقرار کیا ہے، اُن کی زندگیاں محتاط ہیں، وہ حلال اور حرام کا لحاظ رکھتے ہیں، اُن کی نظر ہر وقت جائز اور ناجائز پر رہتی ہے، وہ کسی کا حق مارنا بہت بڑا نقصان سمجھتے ہیں۔ معاملات میں حق اور انصاف کے لئے وہ بڑے سے بڑا نقصان اٹھا لیتے ہیں۔ ان کے اوقات کا بڑا حصہ دین کی خدمت اور ضرورت مندوں کی دیکھ بھال میں صرف ہو جاتا ہے، اگر کوئی وقت آ پڑتا ہے تو ان کاموں کی خاطر یہ اپنی تجارت اور کھیتی کا کام چھوڑ دیتے ہیں۔ اپنی سیر و تفریح اور اپنے آرام کو قربان کر دیتے ہیں۔

دوسری طرف وہ لوگ ہیں، جن کے سامنے سوائے اپنے فائدے کے اور کچھ نہیں، اپنے نفع کی خاطر یہ دوسروں کا نقصان کر دیتے ہیں، حقوق مار لینا اور دوسروں کا مال دبا لینا، اُن کی نظر میں ایک ہُنر ہے۔ اُن کے نزدیک وقت کا بہترین مصرف دولت کمانا ہے یا پھر سیر و تفریح کرنا۔ اِس کے علاوہ وہ تمام کاموں کو بے وقوفی کے کام

سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی نظر میں پہلی قسم کے لوگ سب سے زیادہ بے وقوف لوگ ہیں۔ وہ اُن کی حماقتوں پر ہنستے ہیں، صاف صاف کہہ دیتے ہیں، کہ ”میاں اس زمانے میں یہ ایمانداری نہیں چل سکتی، ایسے ہی سچے بن کر رہو گے، تو دو دن نہیں گزار سکتے۔“

یہ لوگ جب اہلِ ایمان کو دیکھتے ہیں تو اپنے لوگوں کی طرف آنکھوں سے اشارے کرتے ہیں۔ اِن اشاروں کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ ان لوگوں کو انتہائی بے وقوف اور نہایت حقیر سمجھتے ہیں۔ پھر اتنا ہی نہیں کہ وہ یہ اشارے ہی کرتے ہوں، بلکہ اپنے ساتھیوں میں بیٹھ کر ایسے لوگوں کا خوب مذاق اڑاتے ہیں اور جب کبھی سامنا ہو جاتا ہے، تو کہتے ہیں، دیکھو یہ وہ لوگ ہیں جو گمراہ ہو گئے ہیں، ان کے عقیدے خراب ہیں، یہ سیدھے راستے سے بھٹک گئے ہیں۔ حالانکہ اُنہیں یہ سوچنا چاہئے تھا کہ کسی کی گمراہی سے اُنہیں کیا لینا ان کو دوسروں کا نگراں تو بنایا نہیں گیا ہے انہیں ذرا اپنے حال پر بھی تو نظر کرنا چاہئے۔

یہ اس صورت حال کا ایک نقشہ ہے، جو اِس دُنیا میں مومنوں کو پیش آتی ہے، لیکن اس کے برعکس آخرت میں صورتِ حال بالکل اس سے مختلف ہوگی۔

وہاں وہی لوگ جن کو آج بے وقوف سمجھا جاتا ہے، عقل مند ثابت ہوں گے۔ وہی لوگ جو آج دیوالیہ اور خالی ہاتھ ہیں وہاں سب سے زیادہ خوش حال اور خوش نصیب ہوں گے۔ آج جن پر ہنسا جا رہا ہے کل وہی ان ہنسنے والوں پر ہنس رہے ہوں گے، مسندوں پر بیٹھے ہوں گے اور اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں گے کہ جو لوگ ان پر ہنسا کرتے تھے، انہیں ان کے کرتوتوں کی پوری پوری سزا مل گئی۔

(ماخوذ از آسان تفسیر پارہ ۳۰ جناب عبدالحی صاحب)

قیامت اور مُردوں کا زندہ ہونا

قرآن کریم میں ارشاد ہے:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚۖ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ۝ اِذْيَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَ عَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ ۝ مَايَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ۝ وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ ۝ وَنُفِخَ فِى الصُّوْرِ ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ ۝ وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ ۝ لَقَدْ كُنْتَ فِىْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآئَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ۝ وَقَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَىَّ عَتِيْدٌ ۝ اَلْقِيَافِىْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ ۝ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيْبِ ۝ ۣالَّذِىْ جَعَلَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَاَلْقِيٰهُ فِى الْعَذَابِ الشَّدِيْدِ ۝ قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا مَآ اَطْغَيْتُهٗ وَلٰكِنْ كَانَ فِىْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ۝ قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَىَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ ۝ مَايُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَىَّ وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝﴾ (سورۂ ق: ۱۶ تا ۲۹)

ترجمہ: ”اور البتہ ہم نے بنایا انسان کو اور ہم جانتے ہیں، جو باتیں آتی رہتی ہیں اس کے جی میں اور ہم اس سے نزدیک ہیں دھڑکتی رگ سے زیادہ۔ جب لینے جاتے ہیں دو لینے والے، داہنے بیٹھا اور بائیں بیٹھا۔ نہیں بولتا کچھ بات، ہوتا ہے اس کے پاس ایک راہ دیکھنے والا تیار۔ اور

وہ آئی بیہوشی موت کی تحقیق، یہ وہ ہے جس سے تو ٹلتا رہتا تھا۔ اور پھونکا گیا صور یہ ہے دن ڈرانے کا۔ اور آیا ہر ایک جی اس کے ساتھ ہے ایک ہانکنے والا اور ایک احوال بتلانے والا۔ تو بے خبر رہا اس دن سے، اب کھول دی ہم نے تجھ پر سے تیری اندھیری، سو تیری نگاہ آج تیز ہے۔ اور بولا (فرشتہ) اس کے ساتھ والا، یہ ہے جو میرے پاس تھا حاضر۔ ڈال دو تم دونوں دوزخ میں ہر ناشکرے مخالف کو، نیکی سے روکنے والا، حد سے بڑھنے والا، شبہ میں ڈالنے والا۔ جس نے ٹھہرایا اللہ کے ساتھ اور کو پوجنا، سو ڈال دو اس کو سخت عذاب میں۔ بولا (شیطان) اس کا ساتھی اے رب ہمارے! میں نے اس کو شرارت میں نہیں ڈالا پر یہ تھا راہ کو بھولا دور پڑا ہوا۔ فرمایا جھگڑا نہ کرو میرے پاس اور میں پہلے ہی ڈرا چکا تھا تم کو عذاب سے۔ بدلتی نہیں بات میرے پاس اور میں ظلم نہیں کرتا اپنے بندوں پر۔"

خلاصہ تفسیر

(اوپر قیامت میں مُردوں کے زندہ ہونے کا امکان ثابت ہو چکا ہے، آگے اس کے وقوع کا بیان ہے اور وقوع موقوف ہے، علمِ کامل اور قدرتِ کاملہ پر، (اس لئے اوّل اس کو بتلاتے ہیں کہ) اور ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے (جو اعلیٰ درجہ کی دلیل ہے قدرت پر) اور اس کے جی میں جو خیالات آتے ہیں، ہم ان (تک) کو (بھی) جانتے ہیں (تو جو افعال ان کے ہاتھ پاؤں اور زبان سے صادر ہوں، ان کو جاننا تو بدرجۂ اولیٰ ہے) اور (بلکہ ہم کو تو اس کے احوال کا ایسا علم ہے کہ اس کو خود بھی اپنے احوال کا ایسا علم نہیں، پس باعتبار علم کے) ہم انسان کے اس قدر قریب ہیں کہ اس کی رگِ گردن سے بھی زیادہ (جس کے قطع ہونے سے انسان مرجاتا ہے) اور چونکہ

لوگوں کی عام عادت میں جانور کی رُوح نکالنے کے لئے گردن کاٹنے ہی کا طریقہ رائج ہے، اس لئے یہ تعبیر اختیار کی گئی، اور یہ گردن کی رگیں ''ورِید'' اور ''شریان'' دونوں کو محتمل ہیں، مگر ''شریان'' مراد لینا زیادہ مناسب ہے، کیونکہ ان میں روح غالب اور خون مغلوب رہتا ہے، اور ''وَرید'' میں برعکس، اور یہاں جس کو روح میں زیادہ دخل ہو، اس کا مراد لینا مناسب ہے، اور سورۂ حاقہ میں لفظ ''وتین'' بمعنی رگِ دل سے تعبیر کرنا اس کا مؤید ہے، کیونکہ جو رگیں دل سے نکلتی ہیں وہ شرائین ہیں، اور گو قرآن میں لفظ وَرید ہے، مگر معنی لغوی اس کے عام ہیں، جس میں دل سے نکلنے والی رگیں شرائین بھی داخل ہیں اور جگر سے نکلنے والی رگیں ''وَرید'' وغیرہ بھی، پس مطلب یہ ہوا کہ ہم باعتبار علم کے اس کی روح اور نفس سے بھی نزدیک تر ہیں، یعنی جیسا علم انسان کو اپنے احوال کا ہے، ہم کو اس کا علم خود اس سے بھی زیادہ ہے، چنانچہ انسان کو اپنی بہت سی حالتوں کا تو علم ہی نہیں ہوتا اور جن کا علم ہوتا ہے ان میں بھی بعض اوقات نسیان یا ان سے ذہول ہو جاتا ہے اور حق تعالیٰ کے بارہ میں ان احتمالات کی گنجائش ہی نہیں۔

آگے اس کی مزید تاکید کے لئے یہ بیان فرمایا کہ انسان کے اعمال واحوال صرف یہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں محفوظ ہوں، بلکہ ظاہری حجت تمام کرنے کے لئے وہ اعمال فرشتوں کے ذریعہ لکھوا کر بھی محفوظ کئے گئے۔ ارشاد ہے ''جب دو اخذ والے فرشتے (انسان کے اعمال کو جب وہ اس سے صادر ہوتے ہیں) اخذ کرتے رہتے ہیں، جو کہ دائیں اور بائیں طرف بیٹھے رہتے ہیں اور برابر ہر عمل کو لکھتے رہتے ہیں۔ وہ کوئی لفظ منہ سے نہیں نکالنے پاتا، مگر اس کے پاس ہی ایک تاک لگانے والا تیار (موجود ہوتا) ہے'' (اگر وہ نیکی کا کلام ہو تو داہنے والا اس کو ضبط اور تحریر میں لاتا ہے، اگر بدی کا کلام ہو تو بائیں والا، اور جب زبان سے نکلنے والا ایک ایک کلمہ محفوظ و مکتوب ہے، تو دوسرے اعمال کیوں محفوظ نہ ہوں گے، اور چونکہ آخرت کی زندگی اور اعمال کی جزاء وسزاء سب کا مقدمہ موت ہے، اس لئے انسان کو متنبہ کرنے کے لئے

آگے اس کا ذکر ہے، کیونکہ قیامت سے انکار درحقیقت موت سے غفلت ہی کا نتیجہ ہوتا ہے، ارشاد ہے کہ ”ہوشیار ہوجاؤ) موت کی سختی حقیقتاً (قریب) آپہنچی (یعنی ہر شخص کی موت قریب ہے، چنانچہ ظاہر ہے) یہ (موت) وہ چیز ہے، جس سے تو بدکتا (اور بھاگتا) تھا (موت سے بھاگنا طبعی طور پر تو ہر نیک و بد میں یکساں ہے اور کافرو فاجر کا موت سے بھاگنا بوجہ حُبِّ دنیا کے اور بھی زیادہ واضح ہے، کسی خاص بندہ پر اللہ سے ملنے کے شوق کا غلبہ ہوکر موت کا لذیذ اور مطلوب ہوجانا اس کے منافی نہیں، کیونکہ وہ عام عادتِ انسانی سے مافوق حالت ہے) اور (اس مقدمہ یعنی ذکرِ موت کے بعد اب وقوعِ قیامت کا بیان ہے، جو کہ مقصود تھا یعنی قیامت کے دن دوبارہ) صور پھونکا جائے گا، جس سے سب زندہ ہوجائیں گے، یہی دن ہوگا وعید کا (جس سے لوگوں کو ڈرایا جاتا تھا)“ اور (آگے قیامت کے ہولناک واقعات اور حالات کا بیان ہے) اور ہر شخص اس طرح (میدانِ قیامت میں) آئے گا کہ اس کے ساتھ (دو فرشتے ہوں گے جن میں) ایک (تو میدانِ قیامت کی طرف) اس کو اپنے ہمراہ لائے گا اور ایک (اس کے اعمال کا) گواہ ہوگا۔ حدیثِ مرفوع میں ہے کہ یہ سائق اور شہید وہی دو فرشتے ہیں جو زندگی میں انسان کے دائیں اور بائیں اس کے اعمال کو لکھتے تھے۔

(رواہ فی الدر المنثور)

اور اگر یہ حدیث موافقِ شرائط محدثین کے قوی نہ ہو تو احتمال ہے کہ دو فرشتے اور ہوں، جیسا کہ بعض قائل ہوئے ہیں، گویا اس صورت میں بھی بوجہ موافقتِ حدیث کے راجح احتمال اوّل ہی ہوگا اور جب وہ میدانِ قیامت میں حاضر ہوں گے، تو ان میں جو کافر ہوں گے، ان سے خطاب ہوگا کہ تو اس دن سے بے خبر تھا (یعنی اس کا قائل نہ تھا) سو اب ہم نے تجھ پر سے تیرا پردہ (غفلت اور انکار کا) ہٹا دیا (اور قیامت کا معائنہ کرا دیا) سو آج (تو) تیری نگاہ بڑی تیز ہے (کہ کوئی امر مانعِ ادراک نہیں، کاش تو دُنیا میں بھی اس مانعِ غفلت کو رفع کر دیتا، تو تیرے دن بھلے ہوتے، اور اس

کے بعد) فرشتہ (کاتبِ اعمال) جو اس کے ساتھ رہتا تھا (اور اب بھی ایک قول پر سائق یا شاہد بن کر آیا ہے، نامۂ اعمال حاضر کر کے) عرض کرے گا کہ یہ وہ (روزنامچہ) ہے، جو میرے پاس تیار ہے۔

چنانچہ اس روز نامچہ کے موافق کافروں کے بارے میں دو فرشتوں کو خواہ وہ سائق وشہید مذکور ہوں یا اور دو فرشتے ہوں، حکم ہوگا کہ ہر ایسے شخص کو جہنم میں ڈال دو جو کفر کرنے والا ہو اور (حق سے) ضد رکھتا ہو اور نیک کام سے روکتا ہو اور حدِّ (عبدیت) سے باہر ہو جانے والا ہو اور (دین میں) شبہ پیدا کرنے والا ہو، جس نے خدا کے ساتھ دوسرا معبود تجویز کیا ہو، سو ایسے شخص کو سخت عذاب میں ڈال دو (جب کفار کو معلوم ہوگا کہ اب خسارۂ ابدی میں پڑنے والے ہیں، اس وقت اپنے بچاؤ کے واسطے گمراہ کرنے والوں کے ذمہ الزام رکھیں گے کہ ہمارا قصور نہیں، ہمیں تو دوسروں نے گمراہ کیا ہے اور چونکہ ان گمراہ کرنے والوں میں شیاطین بھی داخل ہیں، اس لیے فرمایا،) وہ شیطان جو اس کے ساتھ رہتا تھا کہے گا کہ اے ہمارے پروردگار! میں نے اس کو (جبراً) گمراہ نہیں کیا تھا، جیسا کہ اس کے الزام سے مفہوم ہوتا ہے کہ اس کے اپنے اختیار کو بالکل دخل نہ ہو، لیکن (بات یہ ہے کہ) یہ خود ہی دور دراز کی گمراہی میں (باختیار خود) تھا (گو اغواء میں نے بھی کیا، جس میں کوئی جبر نہ تھا، اس لئے اس کی گمراہی کا اثر مجھ پر نہ ہونا چاہئے) ارشاد ہوگا کہ: میرے سامنے جھگڑے کی باتیں مت کرو (کہ بے سود ہیں) اور میں تو پہلے ہی تمہارے پاس وعید بھیج چکا تھا (کہ جو کفر کرے گا از خود یا کسی کے اغواء سے اور جو کفر کا حکم کرے گا، خواہ اپنی مرضی سے یا کسی کے جبر سے، سب کو جہنم کی سزاء علیٰ تفاوت المراتب دوں گا، سو) میرے ہاں (وہ) بات (وعید مذکور کی) نہیں بدلی جائے گی (بلکہ تم سب دوزخ میں جھونکے جاؤ گے) اور میں (اس تجویز میں) بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہوں (بلکہ بندوں نے خود ایسے ناشائستہ کام کئے، جس کی سزا آج بھگت رہے ہیں)۔

معارف ومسائل

سابقہ آیات میں منکرینِ حشر ونشر اور مُردوں کے زندہ ہونے کو بعید از عقل و قیاس کہنے والوں کے شبہات کا ازالہ اس طرح کیا تھا کہ تم نے حق تعالیٰ کے علم کو اپنے علم وبصیرت پر قیاس کر رکھا ہے، اس لئے یہ اشکال ہے کہ مُردے کے اجزاء مٹی ہو کر دنیا میں بکھرنے کے بعد ان کو کس طرح جمع کیا جاسکتا ہے، مگر حق تعالیٰ نے بتلایا کہ کائنات کا ذرہ ذرہ ہمارے علم میں ہے، ہمارے لئے ان سب کو جب چاہیں جمع کر دینا کیا مشکل ہے۔ آیاتِ مذکورہ میں بھی علمِ الٰہی کی وسعت اور ہمہ گیری کا بیان ہے، کہ انسان کے اجزائے منتشرہ کا علم ہونے سے بھی زیادہ بڑی بات تو یہ ہے کہ ہم ہر انسان کے دل میں آنے والے خیالات کو بھی ہر وقت اور ہر حال میں جانتے ہیں، اور اس کی وجہ دوسری آیت میں یہ بیان فرمائی کہ ہم انسان سے اتنے قریب ہیں کہ اس کی رگ گردن، جس پر اس کی زندگی کا مدار ہے، وہ بھی اتنی قریب نہیں، اس لئے ہم اس کے حالات کو خود اس سے بھی زیادہ جانتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب اس کی تحقیق

”نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ“ کا جمہور مفسرین نے یہی مطلب قرار دیا ہے، کہ قرب سے مراد قربِ علمی اور احاطۂ علمی ہے۔ قرب مسافت مراد نہیں۔

لفظ ”وَرِید“ عربی زبان میں ہر جاندار کی ان رگوں کو کہا جاتا ہے، جن سے خون کا سیلان تمام بدن میں ہوتا ہے۔

طبّی اصطلاح میں یہ دو قسم کی رگیں ہیں۔

ایک وہ جو جگر سے نکلتی ہیں اور خالص خون سارے بدنِ انسانی میں پہنچاتی ہیں، طبی اصطلاح میں صرف انہی رگوں کو "وَرِیْد" (جس کی جمع "اَوْرِدَہ") کہا جاتا ہے۔

دوسری قسم وہ رگیں جو حیوان کے قلب سے نکلتی ہیں اور خون کی وہ لطیف بھاپ جس کو طبی اصطلاح میں رُوح کہا جاتا ہے، وہ اسی طرح تمام بدنِ انسانی میں...... پھیلاتی اور پہنچاتی ہیں، ان کو شریان اور شرائین کہا جاتا ہے۔ پہلی قسم کی رگیں موٹی اور دوسری باریک ہوتی ہیں۔

آیتِ مذکورہ میں یہ ضروری نہیں کہ ورید کا لفظ طبی اصطلاح کے مطابق اس رگ کے لئے لیا جائے، جو جگر سے نکلتی ہے، بلکہ قلب سے نکلنے والی رگ کو بھی لغت کے اعتبار سے ورید کہا جاسکتا ہے، کیونکہ اس میں بھی ایک قسم کا خون ہی دوران کرتا ہے اور اس جگہ چونکہ مقصود آیت کا انسان کے قلبی خیالات اور احوال سے مطلع ہونا ہے، اس لئے وہ زیادہ انسب ہے۔ بہر حال خواہ ورید باصطلاحِ طب، جگر سے نکلنے والی رگ کے معنی میں ہو یا قلب سے نکلنے والی شریانوں کے معنی میں، بہر دو صورت جاندار کی زندگی اس پر موقوف ہے۔ یہ رگیں کاٹ دی جائیں، تو جاندار کی روح نکل جاتی ہے، تو خلاصہ یہ ہوا کہ جس چیز پر انسان کی زندگی موقوف ہے، ہم اس چیز سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں یعنی اس کی ہر چیز کا علم رکھتے ہیں۔

اور صوفیائے کرام کے نزدیک قرب سے مراد اس جگہ صرف قربِ علمی اور احاطۂ علمی ہی نہیں، بلکہ ایک خاص قسم کا اتصال ہے، جس کی حقیقت اور کیفیت تو کسی کو معلوم نہیں ہوسکتی، مگر یہ قُرب و اتصال بلا کیف موجود ضرور ہے، قرآنِ کریم کی متعدد آیات اور احادیث صحیحہ اس پر شاہد ہیں، حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے "وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ." (یعنی سجدہ کرو اور ہمارے قریب ہوجاؤ)۔ اور ہجرت کے واقعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا "اَللّٰہُ مَعَنَا" (یعنی اللہ ہمارے ساتھ ہے) اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے فرمایا

"اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ" (یعنی میرا رب میرے ساتھ ہے) اور حدیث میں ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی طرف سے سب سے زیادہ قریب اس وقت ہوتا ہے جب کہ وہ سجدہ میں ہو، اسی طرح حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "میرا بندہ میرے ساتھ نفلی عبادات کے ساتھ تقرب حاصل کرتا رہتا ہے"۔

یہ قرب وتقرب جو عبادات کے ذریعہ حاصل کیا جاتا ہے اور انسان کے اپنے کسب وعمل کا نتیجہ ہوتا ہے، یہ صرف مومن کے لئے مخصوص ہے، اور ایسے مومنین اولیاء اللہ کہلاتے ہیں، جن کو حق تعالیٰ کے ساتھ یہ تقرب حاصل ہو۔ یہ اتصال وقرب اس قرب کے علاوہ ہے جو حق تعالیٰ کو ہر انسان، مومن وکافر کی جان کے ساتھ یکساں ہے، غرض مذکورہ آیات اور روایات اس پر شاہد ہیں کہ انسان کو اپنے خالق ومالک کے ساتھ ایک خاص قسم کا اتصال حاصل ہے، گو ہم اس کی حقیقت اور کیفیت کا ادراک نہ کر سکیں۔

ہر انسان کے ساتھ دو فرشتے

"اِذْیَتَلَقَّی الْمُتَلَقِّیَان" تلقّی کے لغوی معنی اخذ کرنے، لے لینے اور حاصل کر لینے کے آتے ہیں، قرآن کریم میں دوسری جگہ ارشاد ہے: "فَتَلَقّٰی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّہٖ کَلِمَاتٍ" (یعنی لے لئے اور حاصل کر لئے حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے چند کلمات)۔

اس آیت میں "مُتَلَقِّیَان" سے مراد وہ دو فرشتے ہیں، جو ہر انسان کے ساتھ اس کے اعمال لکھنے کے لئے ہر وقت اس کے ساتھ رہتے ہیں، اور اس کے اعمال کو اپنے صحیفوں میں لکھتے رہتے میں، "عَنِ الْیَمِیْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِیْدٌ" (یعنی ان میں ایک اس کے داہنی طرف رہتا ہے) (جو اس کے اعمالِ صالحہ کو لکھتا ہے) دوسرا اس کے بائیں جانب (جو اس کی سیئات کو لکھتا ہے) "قَعِیْد" (بمعنی قاعد ہے، مفرد وجمع دونوں

کے لئے لفظ قعید استعمال ہوتا ہے، اگرچہ قعید بمعنی قاعد ہے، جیسے جلیس بمعنی جالس، مگر ایک فرق یہ ہے کہ قاعد اور جالس تو صرف بیٹھنے کی حالت میں بولا جاتا ہے، اور قعید وجلیس عام ہے جو کسی کے ساتھ ہو، خواہ بیٹھے یا کھڑے یا چلتے پھرتے ہوئے ہو، ان کو قعید وجلیس کہیں گے، ان دونوں فرشتوں کا یہی حال ہے کہ وہ ہر وقت ہر حال میں انسان کے ساتھ رہتے ہیں، وہ بیٹھا ہو یا کھڑا، چلتا پھرتا ہو یا سو رہا ہو) صرف اوقاتِ ممنوعہ میں یہ فرشتے ہٹ جاتے ہیں، مگر اللہ نے ان کو اس کا ملکہ دیدیا ہے کہ اس حالت میں بھی وہ کوئی گناہ کریں تو ان کو معلوم ہوجاتا ہے۔

علامہ ابنِ کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے احنف بن قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے لکھا ہے کہ ان دو فرشتوں میں سے صاحبِ یمین نیک اعمال لکھتا ہے اور وہ صاحبِ شمال یعنی بائیں جانب کے فرشتے کا بھی نگراں وامین ہے۔ اگر انسان کوئی گناہ کرتا ہے تو صاحبِ یمین صاحبِ شمال سے کہتا ہے کہ ابھی اس کو اپنے صحیفہ میں نہ لکھو، اس کو مہلت دو، اگر توبہ کرلی تو رہنے دو، ورنہ پھر اعمالنامہ میں درج کرو۔

(رواہ ابن ابی حاتم)

اعمالنامہ لکھنے والے فرشتے

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ نے آیتِ مذکورہ "عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْد" تلاوت فرما کر کہا:

اے ابن آدم! تیرے لئے نامۂ اعمال بچھا دیا گیا ہے، اور تجھ پر دو معزز فرشتے مقرر کر دیئے ہیں، ایک تیری داہنی جانب، دوسرا بائیں جانب، داہنی جانب والا تیری حسنات کو لکھتا ہے اور بائیں جانب والا تیری سیئات اور گناہوں کو، اب اس حقیقت کو سامنے رکھ کر جو تیرا جی چاہے عمل کر، چاہے کم کر یا زیادہ، یہاں تک کہ جب تو مرے گا، تو یہ صحیفہ یعنی نامۂ

اعمال لپیٹ دیا جائے گا، اور تیری گردن میں ڈال دیا جائے گا، جو تیرے ساتھ قبر میں جائے گا اور تیرے ساتھ رہے گا، یہاں تک کہ جب تو قیامت کے روز قبر سے نکلے گا، تو اس وقت حق تعالیٰ فرمائے گا "وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا ۝ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا" (یعنی ہم نے ہر انسان کا اعمالنامہ اس کی گردن میں لٹکا دیا ہے اور قیامت کے روز وہ اس کو کھلا ہوا پائے گا، اب اپنا اعمالنامہ خود پڑھ لے تو خود ہی اپنا حساب لگانے کے لئے کافی ہے)

پھر حضرت حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: خدا کی قسم! اس ذات نے بڑا عدل وانصاف کیا، جس نے خود تجھ کو ہی تیرے اعمال کا محاسب بنا دیا۔ (ابن کثیر)

یہ ظاہر ہے کہ اعمالنامہ کوئی دنیوی کاغذ تو ہے نہیں، جس کے قبر میں ساتھ جانے اور قیامت تک باقی رہنے پر اشکال ہو، ایک معنوی چیز ہے، جس کی حقیقت حق تعالیٰ ہی جانتے ہیں، اس لئے اس کا ہر انسان کے گلے کا ہار بننا اور قیامت تک باقی رہنا کوئی تعجب کی بات نہیں۔

انسان کا ہر قول ریکارڈ کیا جاتا ہے

"مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ" (یعنی انسان کوئی کلمہ زبان سے نہیں نکالتا، جس کو یہ نگراں فرشتہ محفوظ نہ کر لیتا ہو۔

حضرت حسن بصری اور حضرت قتادہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: یہ فرشتے اس کا ایک ایک لفظ لکھتے ہیں، خواہ اس میں کوئی گناہ یا ثواب ہو یا نہ ہو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ: صرف وہ کلمات لکھے جاتے ہیں، جن پر کوئی ثواب یا عتاب ہو۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ دونوں اقوال نقل کرنے کے بعد فرمایا: کہ آیتِ قرآن کے عموم سے پہلی ہی بات کی ترجیح معلوم ہوتی ہے، کہ ہر ہر لفظ لکھا جاتا ہے، پھر علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ تعالیٰ کی ایک روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما ہی سے ایسی نقل فرمائی جس میں یہ دونوں اقوال جمع ہو جاتے ہیں۔

اس روایت میں یہ ہے کہ پہلے تو ہر کلمہ لکھا جاتا ہے، خواہ گناہ وثواب اس میں ہو یا نہ ہو، مگر ہفتہ میں جمعرات کے روز اس پر فرشتے نظر ثانی کر کے صرف وہ کلمات رکھ لیتے ہیں، جن میں ثواب یا عتاب ہو یعنی خیر یا شر ہو، باقی کو نظر انداز کر دیتے ہیں) قرآنِ کریم کی آیت: "یَمْحُو اللّٰہُ مَایَشَآءُ وَیُثْبِتُ وَعِنْدَہٗ اُمُّ الْکِتٰبِ" کے مفہوم میں یہ مٹانا اور باقی رکھنا بھی داخل ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت بلال بن حارث مزنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"انسان بعض اوقات کوئی کلمہ خیر بولتا ہے جس سے اللہ تعالی راضی ہوتا ہے، مگر یہ اس کو معمولی بات سمجھ کر بولتا ہے، اس کو پتہ بھی نہیں ہوتا کہ اس کا ثواب کہاں تک پہنچا، کہ اللہ تعالیٰ اس کے لئے اپنی رضائے دائمی قیامت تک لکھ دیتے ہیں، اسی طرح انسان کوئی کلمہ اللہ کی ناراضی کا (معمولی سمجھ کر) زبان سے نکال دیتا ہے۔ اس کو گمان ہی نہیں ہوتا کہ اس کا گناہ اور وبال کہاں تک پہنچے گا، اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اس شخص سے اپنی دائمی ناراضی قیامت تک کے لئے لکھ دیتے ہیں۔" (ابن کثیر)

حضرت علقمہ رحمہ اللہ تعالیٰ حضرت بلال بن حارث رضی اللہ تعالی عنہ کی یہ حدیث نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اس حدیث نے مجھے بہت سی باتیں زبان سے نکالنے کو روک دیا ہے۔ (ابن کثیر)

سکرات الموت

”وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ“، سکرۃ الموت کے معنی موت کی شدت اور غشی کے ہیں جو موت کے وقت پیش آتی ہے۔

ابوبکر بن الانباری رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت مسروق رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی ہے کہ جب حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر موت کے آثار شروع ہوئے، تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو بلایا، وہ پہنچیں تو یہ حالت دیکھ کر بیساختہ ایک شعر زبان سے نکلا ؎

اِذَا حَشْرَجَتْ يَوْمًا وَضَاقَ بِهَا الصَّدْرُ

ترجمہ: ”یعنی جب روح ایک دن مضطرب ہوگی اور سینہ اس سے تنگ ہو جائے گا۔“

حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سنا تو فرمایا کہ تم نے فضول یہ شعر پڑھا، یوں کیوں نہ کہا ”جَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ حالت پیش آئی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ...... پانی میں ہاتھ ڈال کر چہرہ مبارک پر ملتے اور فرماتے تھے ”لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اِنَّ لِلْمَوْتِ سَكَرَاتٍ“ یعنی کلمہ طیبہ پڑھتے ہوئے فرمایا کہ موت کی بڑی شدتیں ہوتی ہیں۔

”بِالْحَقِّ“ اس میں حرف باء تعدیہ کے لئے ہے، معنی یہ ہیں کہ لے آئی شدتِ موت امرِ حق کو یعنی موت کی شدت نے وہ چیزیں سامنے کر دیں، جو حق و ثابت ہیں اور کسی کو ان سے فرار کی گنجائش نہیں۔ (مظہری)

”ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ“ تَحِيْدُ سے مشتق ہے، جس کے معنی مائل ہونے، جگہ سے ہٹ جانے اور اقرار کرنے کے ہیں، معنی آیت کے یہ ہیں کہ موت وہ چیز

ہے جس سے تو بدکتا اور بھاگتا تھا۔

ظاہر یہ ہے کہ یہ خطاب عام انسان کو ہے، موت سے بدکنا اور بھاگنا طبعی طور پر پوری نوعِ انسانی میں پایا جاتا ہے، ہر شخص زندگی کو مرغوب اور موت کو آفت و مصیبت سمجھ کر اس سے بچنے کی تدبیریں کرتا ہے، جو شرعاً کوئی گناہ بھی نہیں، لیکن آیت میں بتلانا یہ منظور ہے کہ انسان کی یہ طبعی اور فطری خواہش مکمل طور پر ہرگز پوری نہیں ہوسکتی، ایک نہ ایک دن تو بہر حال موت آنا ہی ہے، خواہ تم اس سے کتنا ہی بھاگنا چاہو۔

انسان کو میدانِ حشر میں لانے والے دو فرشتے

”وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّ شَهِيْدٌ“ اس آیت سے اوپر قیامت قائم ہونے کا ذکر ہے، اس آیت میں میدانِ حشر میں تمام انسانوں کے حاضر ہونے کی ایک خاص کیفیت بیان کی گئی ہے کہ ہر انسان کے ساتھ ایک سائق اور ایک شہید ہوگا۔

سائق کہتے ہیں اس شخص کو جو جانوروں یا کسی جماعت کے پیچھے رہ کر اس کو کسی خاص جگہ پر پہنچانا چاہتا ہے۔

اور شہید کے معنی گواہ کے ہیں، سائق کا فرشتہ ہونا تو باتفاق روایات سے ثابت ہے، شہید کے بارے میں علماء تفسیر کے اقوال مختلف ہیں۔

بعض کے نزدیک وہ بھی ایک فرشتہ ہی ہوگا، اس طرح سائق اور شہید دو فرشتے ہوگئے، ایک کا کام اس کو میدانِ حشر میں پہچانا ہے، دوسرے کا کام یہ ہے کہ جب اس کے اعمال پیش ہوں تو وہ اس پر گواہی دیں۔

یہ دو فرشتے وہ بھی ہوسکتے ہیں جو انسان کے دائیں اور بائیں اعمال کی کتابت کے لئے ہر وقت دنیا میں ساتھ رہتے ہیں، یعنی کراماً کاتبین، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے علاوہ اور دو ہوں۔

اور شہید کے متعلق بعض حضرات نے فرمایا کہ وہ انسان کا عمل ہوگا، اور بعض نے خود اسی انسان کو شہید فرمایا۔

علامہ ابنِ کثیر رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ظاہر آیت سے یہی ہے کہ وہ بھی ایک فرشتہ ہی ہوگا، جو اس کے اعمال پر شہادت دے گا، حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خطبہ میں یہ آیت تلاوت فرما کر یہی تفسیر فرمائی ہے، اور حضرت مجاہد، قتادہ رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے مفسرین سے بھی یہی منقول ہے، ابنِ جریر نے رحمہ اللہ تعالیٰ اسی کو ترجیح دی ہے۔

مرنے کے بعد آنکھیں وہ سب کچھ دیکھیں گی جو زندگی میں نہ دیکھ سکتی تھیں

"فَکَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآئَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ" (یعنی ہم نے تمہاری آنکھوں سے پردہ ہٹا دیا، آج تمہاری نگاہ بڑی تیز ہے) اس کا مخاطب کون ہے؟ اس میں بھی مفسرین کے اقوال مختلف ہیں، مگر راجح یہی ہے کہ عام انسان مخاطب ہیں، جن میں مومن، کافر، متقی، فاسق، سب داخل ہیں۔ اسی تفسیر کو علامہ ابنِ جریرؒ، ابنِ کثیرؒ وغیرہ نے اختیار فرمایا ہے، اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ دنیا کی زندگی کی مثال خواب کی سی ہے، اور آخرت کی مثال بیداری کی، جیسے خواب میں آدمی کی آنکھیں بند ہوتی ہیں، کچھ نہیں دیکھتا، اسی طرح انسان اُن حقائق کو جن کا تعلق عالمِ آخرت سے ہے، دنیا میں آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا، مگر یہ ظاہری آنکھیں بند ہوتے ہی وہ خواب کا عالم ختم ہوکر بیداری کا عالم آتا ہے، جس میں وہ سارے حقائق سامنے آجاتے ہیں۔ اسی لئے بعض علماء نے فرمایا "اَلنَّاسُ نِیَامٌ فَاِذَا مَاتُوْا انْتَبَهُوْا" (یعنی اس دنیا کی زندگی میں سب انسان سو رہے ہیں، جب مریں گے اس وقت جاگیں گے)

"قَالَ قَرِیْنُهٗ هٰذَا مَالَدَیَّ عَتِیْدٌ" یہاں قرین سے مراد وہ فرشتہ ہے جو انسان

کے ساتھ اس کے اعمال لکھنے کے لئے رہتا تھا، اور پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ کاتبِ اعمال دو فرشتے ہیں، مگر قیامت میں انسان کی حاضری کے وقت ایک کو سائق اور دوسرے کو شہید کے نام سے پکارا جائے گا، جیسا کہ اس سے پہلی آیت میں فرمایا ہے، اس لئے نسقِ کلام سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ کاتبِ اعمال دو فرشتوں کو میدانِ حشر میں اس کی حاضری کے وقت دو کام سپرد کر دیئے گئے ہیں۔

ایک کے ذمہ اس کے پیچھے رہ کر اس کو میدانِ حشر میں پہنچانا لگایا گیا، جس کو آیت میں سائق کا نام دیا گیا ہے۔

دوسرے کے سپرد اس کے نامۂ اعمال کر دیئے گئے، جس کو شہید کے نام سے تعبیر کیا گیا، تو میدانِ حشر میں پہنچنے کے بعد نامۂ اعمال والا فرشتہ یعنی شہید یہ عرض کرے گا "هٰذَا مَالَدَیَّ عَتِیْدٌ" یعنی اس کے اعمال میرے پاس لکھے ہوئے موجود ہیں، علامہ ابنِ جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں فرمایا کہ یہاں لفظ "قرین" سائق اور شہید دونوں کو شامل ہے۔

"اَلْقِیَا فِیْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِیْدٍ" لفظ اَلْقِیَا تَثْنِیَه کا صیغہ ہے جو دو شخصوں کے لئے بولا جاتا ہے، اس آیت میں جن دو فرشتوں کو خطاب ہے وہ کون ہیں؟ ظاہر یہی ہے کہ یہی دو فرشتے جن کو پہلے سائق اور شہید کہا گیا ہے اس کے مخاطب ہیں بعض حضرات مفسرین نے دوسری توجیہات بھی لکھی ہیں۔ (ابن کثیر)

"قَالَ قَرِیْنُهٗ رَبَّنَا مَآ اَطْغَیْتُهٗ" لفظ قرین کے اصلی معنی پاس رہنے والے اور ملے ہوئے کے ہیں، اس معنی کے اعتبار سے پچھلی آیت میں قرین سے مراد وہ فرشتہ یا فرشتے لئے گئے ہیں جو انسان کے اعمال لکھتے ہیں اور انسان کے ساتھ جیسے دو فرشتے قرین بنائے گئے ہیں، اس طرح ایک شیطان بھی ہر انسان کا قرین رہتا ہے، جو اس کو گمراہی اور گناہوں کی طرف بلاتا ہے، اس آیت میں قرین سے یہی شیطان مراد ہے، جب اس شخص کو جہنم میں ڈالنے کا حکم ہو جائے گا، تو یہ شیطان اس سے اپنی برأت کا

اظہار کرے گا کہ اس کو میں نے گمراہ نہیں کیا، بلکہ یہ خود ہی گمراہ تھا کہ گمراہی کی بات کو قبول کرتا اور نیک بات پر کان نہ دھرتا تھا۔ ظاہرِ کلام سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہنم میں جانے والا اس وقت یہ عذر کرے گا کہ مجھے تو اس شیطان نے بہکایا تھا، ورنہ میں نیک کام کرتا۔ اس کے جواب میں شیطان اپنی برأت ظاہر کرے گا، ان دونوں کے جھگڑے کے جواب میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہوگا۔

"لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَیَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَیْکُمْ بِالْوَعِیْدِ" (یعنی میرے سامنے جھگڑا نہ کرو، میں تو پہلے ہی انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ تمہارے فضول عذر کا جواب دے چکا ہوں اور آسمانی کتابوں کے ذریعہ دلائل واضح کر چکا ہوں، یہ فضول عذر تراشی اور جھگڑا آج نہ چلے گا)۔

"مَایُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَیَّ وَمَا اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ" (میرے پاس قول بدلا نہیں کرتا، جو فیصلہ کر دیا ہے وہ نافذ ہوگا، اور ہم نے کسی پر کوئی ظلم نہیں کیا، عین انصاف کا فیصلہ ہے)۔

(معارف القرآن)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۝﴾ (سورہ البقرہ: ۲۵۷)

ترجمہ: ''اللہ ایمان والوں کا ساتھی ہے، ان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔''

یہ دنیا ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے

قرآن کریم میں ارشاد ہے:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

﴿اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۝ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۝ وَاِذَا
الْاَرْضُ مُدَّتْ ۝ وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ ۝ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا
وَحُقَّتْ ۝ يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ
۝ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۝ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا
يَّسِيْرًا ۝ وَّيَنْقَلِبُ اِلٰى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۝ وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ
وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ۝ فَسَوْفَ يَدْعُوْ ثُبُوْرًا ۝ وَّيَصْلٰى سَعِيْرًا ۝
اِنَّهٗ كَانَ فِيْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۝ اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ ۝ بَلٰى ج
اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا ۝ فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ۝ وَالَّيْلِ وَمَا
وَسَقَ ۝ وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ۝ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ۝ فَمَا
لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَاِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ ۝
بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُكَذِّبُوْنَ ۝ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ ۝ فَبَشِّرْ
هُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ
غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝﴾ (سورۃ الانشقاق)

ترجمہ: "شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا ہی مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ جب آسمان پھٹ جائے گا اور اپنے رب کے احکام پر کان دھرے گا اور یہی اس کے لئے زیبا ہے۔ اور جب زمین کھینچ کر

ہموار کر دی جائے گی۔ اور جو کچھ اس کے اندر ہے، سب اگل دے گی اور خالی ہو جائے گی۔ اور اپنے رب کے احکام پر کان دھرے گی اور یہی اس کے لئے زیبا ہے۔ اَے انسان! تو جو کچھ کمائی کر رہا ہے، تجھے اس کا بدلہ اپنے رب سے پانا ہے (اور اِس کے لئے) تجھے اُس کے حضور پیش ہونا ہے۔ تو جس کا اعمال نامہ اس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا، اُس سے آسان حساب لیا جائے گا، اور وہ اپنے لوگوں کے پاس خوش خوش لوٹ آئے گا۔ اور جس شخص کا اعمال نامہ اس کی پیٹھ کے پیچھے سے دیا جائے گا، تو وہ پکارے گا۔ ''ہائے میری بربادی''۔ اور وہ بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوگا۔ بلاشبہ وہ دنیا میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ (متکبرانہ طور پر) خوش رہا کرتا تھا (اسے اس دن کا کوئی ڈر ہی نہ تھا)۔ اس کو تو یہ خیال ہو گیا تھا کہ اسے لوٹ کر (ہمارے پاس) آنا ہی نہیں ہے۔ (لیکن اس کا یہ خیال غلط تھا) لوٹ کر کیوں نہیں آنا تھا؟ بلاشبہ اس کا رب تو اس سے باخبر تھا ہی۔ تو (منکروں نے جو جو خیالات قائم کر رکھے ہیں وہ سب) کچھ نہیں۔ میں قسم کھاتا ہوں شام کی سرخی، اور رات کی اور ان چیزوں کی جن کو رات سمیٹ لیتی ہے، اور چاند کی جب وہ پورا ہو جائے۔ تم ضرور درجہ بدرجہ (ایک حالت سے دوسری حالت میں) چڑھو گے۔ تو انہیں کیا ہو گیا ہے کہ ایمان نہیں لاتے؟ اور جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے، تو یہ سجدے میں نہیں گر پڑتے؟ (نہیں، یہ بات نہیں ہے) بلکہ جن لوگوں نے انکار کی رَوِش اختیار کر لی ہے وہ (آخرت کو) جھٹلاتے ہیں۔ اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ یہ جمع کر رہے ہیں، تو انہیں ایک درد ناک عذاب کی خوش خبری دے دو۔ البتہ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے عمل کئے، ان کے لئے ایسا اَجر ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں۔''

تشریح:

﴿اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۝ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۝ وَاِذَا
الْاَرْضُ مُدَّتْ ۝ وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ ۝ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا
وَحُقَّتْ ۝ يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ
۝ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۝ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا
يَّسِيْرًا ۝ وَّيَنْقَلِبُ اِلٰۤى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۝ وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ
وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ۝ فَسَوْفَ يَدْعُوْا ثُبُوْرًا ۝ وَّيَصْلٰى سَعِيْرًا ۝
اِنَّهٗ كَانَ فِيْۤ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۝ اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ ۝ بَلٰۤى اِنَّ
رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا ۝﴾

ترجمہ: ''جب آسمان پھٹ جائے گا اور اپنے رب کے احکام پر کان دھرے گا اور یہی اس کے لئے زیبا ہے۔ اور جب زمین کھینچ کر ہموار کر دی جائے گی اور جو کچھ اس کے اندر ہے، سب اگل دے گی۔ اور خالی ہو جائے گی۔ اور اپنے رب کے احکام پر کان دھرے گی اور یہی اس کے لئے زیبا ہے۔ اے انسان! تو جو کچھ کمائی کر رہا ہے، تجھے اس کا بدلہ اپنے رب سے پانا ہے (اور اس کے لئے) تجھے اس کے حضور پیش ہونا ہے۔ تو جس کا اعمال نامہ اس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا، اس سے آسان حساب لیا جائے گا، اور وہ اپنے لوگوں کے پاس خوش خوش لوٹ آئے گا۔ اور جس شخص کا اعمال نامہ اس کی پیٹھ کے پیچھے سے دیا جائے گا تو وہ پکارے گا۔ ''ہائے میری بربادی''۔ اور وہ بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوگا۔ بلاشبہ وہ دُنیا میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ (متکبرانہ طور پر) خوش رہا کرتا تھا (اُسے اُس دن کا کوئی ڈر ہی نہ تھا)۔ اُس کو تو یہ خیال ہو گیا تھا کہ اُسے لوٹ کر (ہمارے پاس) آنا نہیں ہے۔ (لیکن اس کا یہ خیال

غلط تھا) لوٹ کر کیوں نہیں آنا تھا؟ بلاشبہ اس کا رب تو اس سے باخبر تھا ہی۔"

سورۃ کی ابتدا میں قیامت کا وہ نقشہ پیش کیا گیا ہے، جب یہ تمام نظامِ کائنات درہم برہم ہو جائے گا، نہ اجرامِ سماوی کا یہ نظام باقی رہے گا اور نہ زمین کی موجودہ ہیئت برقرار رہے گی۔ ایک نیا نظام ہوگا اور ایک نئی دنیا۔ اس نقشے کے پیش کرنے کے ساتھ ایک نہایت اہم بات یہ کہی گئی ہے کہ آسمان اور زمین دونوں اپنے رب کے احکام پر کان دھریں گے، اور یہی ان کے لئے شایانِ شان بھی ہے۔ اس حقیقت کے اظہار میں ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کی مالکیت اور اِس کے اقتدار کو سامنے لانا ہے، اور انسان کو یہ جتانا ہے کہ جس خدا کی اطاعت سے تو منہ موڑ رہا ہے، اس کا حکم کس طرح اِس پوری کائنات پر حاوی ہے، اور دوسری طرف اس میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیّت اور اقتدار کی ایک دلیل پوشیدہ ہے، اور وہ یہ کہ آسمان اور زمین اِس لئے اُس کے احکام پر کان دھرتے ہیں کہ وہ اُن کا رب ہے، اُن کا آقا، مالک اور پالنے والا ہے اور اُن کے وجود اور بقا کا مدار اُسی کے حکم اور اُسی کے رحم پر ہے۔ پھر جب انسان بھی اِس کائنات کا ایک جزو ہے اور اُس کا رب بھی وہی اللہ ہے، تو پھر کیا وجہ ہے کہ وہ اُس کے احکام پر کان نہ دھرے؟ کیا محض اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ارادے اور انتخاب کی تھوڑی سی آزادی دے رکھی ہے، اس کے لئے سرکشی جائز ہوسکتی ہے؟

ان آیات کی ابتدا "اِذَا" (جب) کے لفظ سے ہوتی ہے یعنی جب ایسا اور ایسا ہوگا تو کیا ہوگا؟ یہ بات یہاں بیان نہیں کی گئی ہے۔ اس کی تفصیل قرآنِ پاک میں جگہ جگہ بیان کی گئی ہے اور وہ یہ کہ جب ایسا ہوگا تو وہی جزاء کا دن ہوگا۔ اُسی دن سب انسانوں کو اُن کے کاموں کا بدلہ ملے گا۔ اور اُسی دن ہر شخص کا کیا دھرا سامنے آجائے گا یہی وہ دن ہے جس کا یقین اور جس کی فکر انسان کی زندگی کے رُخ کو درست کرسکتی ہے۔

ہر شخص کسی نہ کسی کام میں لگا ہوا ہے، اس کی قوتیں اور اس کی صلاحیتیں مختلف کاموں میں صرف ہو رہی ہیں، ان سب محنتوں اور کوششوں کا بدلہ اُسے اُس کے رب سے مل کر رہے گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ انسان کی یہ تمام جدوجہد یوں ہی بلانتیجہ رہے۔ یقیناً اُسے اِن کاموں کا بدلہ مل کر رہے گا اور اِسی غرض کے لئے اسے اپنے حقیقی مالک اور آقا کے حضور پیش ہونا پڑے گا۔ اچھے کاموں کا بھی بدلہ ملے گا، اور برے کاموں کا بھی۔

اپنے اعمال کے انجام کے لحاظ سے تمام انسان دو گروہوں میں بٹ جائیں گے۔ ایک گروہ خوش نصیب ہوگا اور دوسرا بدنصیب۔ خوش نصیبی کی علامت یہ ہوگی کہ اُن کا اعمال نامہ اُن کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا اور بدنصیبی کی نشانی یہ ہوگی کہ اُن کا اعمال نامہ ان کی پیٹھ کے پیچھے سے دیا جائے گا اور وہ اُن کے بائیں ہاتھ میں ہوگا۔

جن خوش نصیبوں کو اعمال نامہ داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا، اُن کا حساب آسان ہوگا۔ آسان حساب کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے سے ہر ہر جزو کے بارے میں پوچھ گچھ نہ کرے گا۔ اگر کہیں کسی شخص کے ہر ہر معاملے کی کرید کی گئی، تو وہ نہیں بچ سکتا، ایک بندۂ مومن جو اپنی حد تک اللہ کی اطاعت پر چلتا رہا ہے اور جس نے اپنی مقدور بھر اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے، اس کے ساتھ معاملہ رحم اور عنایت کا ہوگا، اس کے چھوٹے چھوٹے قصور معاف کر دیئے جائیں گے۔

لیکن اللہ کے باغیوں کے ساتھ معاملہ انصاف کا ہوگا۔ ان کے ایک ایک کرتوت کی سزا ان کو دی جائے گی، ان کا ہر چھوٹا اور بڑا کام انصاف کے ترازو پر رکھ دیا جائے گا اور جس جُرم کی جو سزا ہوگی، وہ انہیں بھگتنا پڑے گی۔ دوسری جگہ مومنوں سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبٰٓئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ۝﴾ (النساء:۳۱)

ترجمہ: ''اگر تم ان بڑے گناہوں سے بچتے رہو، جن سے تمہیں منع کیا جا رہا ہے، تو تمہاری چھوٹی برائیوں کو ہم تمہارے حساب سے کم کر دیں گے اور تم کو عزت کی جگہ داخل کریں گے۔''

ایک اور جگہ بڑے بڑے گناہوں کی سزا کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد فرمایا:

﴿اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ وَّكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝﴾ (الفرقان:۷۰)

ترجمہ: ''(یہ سزائیں بہ تقاضائے انصاف ہر شخص کو مل کر رہیں گی) الا یہ کہ کوئی ان گناہوں کے بعد توبہ کر چکا ہو اور ایمان لا کر عملِ صالح کرنے لگا ہو ایسے لوگوں کی برائیوں کو اللہ بھلائیوں سے بدل دے گا اور وہ بڑا غفور رحیم ہے۔''

سرکشوں اور باغیوں کی ایک ایک چیز کا حساب ہوگا، ان کے ساتھ معاملہ انصاف کا کیا جائے گا، لیکن وفاداروں کے ساتھ معاملہ رحم و کرم کا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اپنے ہر گناہ گار بندے کے لئے اپنا دامنِ رحمت کھولے ہوئے ہے، بشرطیکہ وہ اپنے غلط کاموں پر شرمندہ ہو اور آئندہ بھلے راستے پر چلنے کا وعدہ کرے۔

اس مضمون کی بہت سی آیتیں قرآنِ پاک میں آئی ہیں۔

ان خوش نصیب لوگوں پر جن کے اعمال نامے اُن کے داہنے ہاتھ میں دیئے گئے ہوں گے، اللہ تعالیٰ کی ہر قسم کی عنایات ہوں گی۔ اِن ہی عنایتوں میں سے ایک عنایت یہ ہوگی کہ وہ اپنے شناسا اور اپنے گھر والوں کے ساتھ ہوں گے۔ بشرطیکہ یہ گھر والے اللہ کے فرماں بردار رہے ہوں۔ انسان کے لئے ہزار نعمتوں سے بڑھ کر ایک نعمت یہ بھی ہوگی کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ رہے، جن سے اسے دِلی لگاؤ ہو۔ ہر شخص اپنے جان پہچان، اپنے عزیز اور اپنے گھر والوں کے ساتھ رہنا پسند کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو اس نعمت سے بھی نوازے گا اور ان کے لئے خوشی کا یہ سامان بھی

مہیّا فرمائے گا۔

ان کے برخلاف جو لوگ اللہ کے باغی اور نافرمان رہے اور جنہوں نے اِس دُنیا ہی کی لذتوں کو اپنا مقصود بنا لیا، اُن کے لئے وہاں کوئی حصہ نہ ہوگا۔ انہوں نے اپنا وقت غفلت میں گزارا، یہ دُنیا میں اپنے اہل وعیال اور اپنے ہم مشرب لوگوں کے ساتھ ایسے مگن رہے کہ انہوں نے اس کی بالکل پرواہ نہیں کی کہ زندگی کن کاموں میں بسر ہو رہی ہے، انہوں نے آخرت کا انکار کیا، اسی انکار کی وجہ سے یہ غفلت کا شکار ہو گئے اور انجام سے بے پروا ہو کر زندگی گزارتے رہے۔

آخرت کے بارے میں منکروں کا یہ خیال کہ آخرت نہ ہوگی، کسی سوچے سمجھے فیصلے کی بنیاد پر نہیں ہے، بلکہ یہ اس بات کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے سنجیدگی کے ساتھ دُنیا اور اس کے حالات پر غور ہی نہیں کیا۔ وہ اگر ذرا بھی غور کرتے تو اس نتیجے پر پہنچ جاتے کہ یہ عالم بے خُدا نہیں ہے، یہ حکمت اور تدبیر کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے، اِس کا ایک خالق ہے، اُسی نے انسان کو بھی پیدا کیا ہے، اُسے طرح طرح کے انعامات واکرام سے نوازا ہے، زندگی اور اس کا سارا سامان دیا ہے، پھر انسان یہاں جو کچھ کر رہا ہے، وہ اُس کے علم میں ہے، وہ اپنے باغیوں اور ناشکروں کو دیکھ رہا ہے اور اس کے فرماں بردار اور شکر گزار بھی اس کی نظر میں ہیں۔ پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ یہ دونوں قسم کے لوگ اِس دنیا کی زندگی گزار کر ختم ہو جائیں؟ باغیوں کو کوئی سزا نہ ملے؟ بلکہ وہ بظاہر عیش وآرام کے ساتھ وقت گزارتے رہیں اور وفاداروں کو کوئی انعام نہ ملے، بظاہر وہ تکلیف اور مصیبت میں رہیں، یہ تو بڑی بے انصافی ہوگی۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ بدلے کا ایک دن آئے اور سب کو بدلہ دیا جائے۔ رحمت کا تقاضا ہے کہ فرماں برداروں کو نعمت سے نوازا جائے۔ حکمت کا تقاضا ہے کہ یہ عالم بے مقصد نہ ہو۔

﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ۝ وَالَّیْلِ وَمَا وَسَقَ ۝ وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ۝ لَتَرْکَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ۝ فَمَا لَھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝ وَاِذَا

قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ ﴿۲۱﴾

ترجمہ: ''تو (منکروں نے جو جو خیالات قائم کر رکھے ہیں وہ سب) کچھ نہیں۔ میں قسم کھاتا ہوں شام کی سرخی کی۔ اور رات کی اور ان چیزوں کی جن کو رات سمیٹ لیتی ہے۔ اور چاند کی جب وہ پورا ہو جائے۔ تم ضرور درجہ بدرجہ (ایک حالت سے دوسری حالت میں) چڑھو گے۔ تو انہیں کیا ہو گیا ہے کہ ایمان نہیں لاتے۔ اور جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے تو یہ سجدے میں نہیں گر پڑتے۔''

آیت نمبر ۱۶ کا پہلا لفظ ''لَا'' ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کے چند نمونے دلیل کے طور پر پیش کئے ہیں۔ ''لَا'' کے معنی ہیں ''نہیں'' یہ اس موقع پر بڑا جامع لفظ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کے منکروں نے جو تصوّرات قائم کر رکھے ہیں، وہ سب غلط ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مرنے کے بعد نہ کوئی حساب و کتاب ہو گا اور نہ جزا اور سزا۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن اللہ کی طرف سے نہیں آرہا ہے، بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اسے خود تصنیف کرتے ہیں۔ وہ قیامت کا بھی انکار کرتے ہیں اور مر کر مٹی ہو جانے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا بھی ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ ان کے یہ سب خیالات غلط ہیں، انہوں نے جو تصورات قائم کر رکھے ہیں وہ سب کچھ بھی نہیں، قیامت ضرور آئے گی، ہر شخص کو حساب و کتاب سے دوچار ہونا پڑے گا اور اپنے اپنے اعمال کے لحاظ سے سزا یا انعام پانا ہو گا۔

منکرین کے ان خیالات کی تردید کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کے کچھ نمونے بطور دلیل کے پیش کئے ہیں۔ مثلاً دن ختم ہوتا ہے اور شام کی سرخی اس بات کا اعلان کرتی ہے کہ سورج جس کی چمک دمک نے دن بھر دنیا کو روشن رکھا تھا، اب غروب ہو گیا، اس کے بعد رات آجاتی ہے۔ رات کی سیاہی پھیل جاتی ہے اور ہر چیز کو اپنے اندھیرے کی چادر میں لپیٹ لیتی ہے، لیکن جس طرح دن کی روشنی کو قیام

نہیں تھا، اسی طرح رات کے اندھیرے کو بھی بقا نہیں۔ یہاں جو حالت ہے، وہ برابر بدل رہی ہے۔ چنانچہ اندھیرا چھا جانے کے بعد پورا چاند نکل آتا ہے اور پھر اجالا ہو جاتا ہے، یہ وہ تبدیلیاں ہیں، جو روزانہ تمہاری نظروں کے سامنے ہو رہی ہیں۔ تم دیکھتے ہو کہ یہاں کسی حال کو قرار نہیں۔

پھر تم اپنی حالت کو دیکھو، یہ بھی یکساں نہیں رہتی، بچپن ہے، جوانی ہے، بڑھاپا ہے، حالات برابر بدلتے رہتے ہیں، تو جو خدا یہ تمام تصرفات کر رہا ہے، جس کی قدرت سے یہ ساری تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، اس کے لئے یہ کیا مشکل ہے کہ وہ دُنیا کے اس نظام کو جب چاہے ختم کر دے اور پھر جب چاہے دوبارہ قائم کر دے؟ جس خدا نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا اور جس کے حکم سے تمہیں موت آتی ہے، اس کے لئے کیا دشوار ہے کہ وہ جب چاہے تمہیں دوبارہ زندہ کر دے؟ دنیا کے بدلتے حالات اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ دنیا کا موجودہ نظام باقی نہیں رہے گا، قیامت آئے گی، انسان دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور وہ سب کچھ ہوگا جس کی خبر قرآن کریم دے رہا ہے۔

انسان کے امتحان کے لئے ضروری تھا کہ اس دُنیا کا انجام انسان کی نظروں سے پوشیدہ رکھا جاتا، لیکن ایک دن ایسا آئے گا کہ قیامت کی جس حقیقت پر پردہ ڈال دیا گیا ہے، وہ اٹھا لیا جائے گا۔

جس طرح اندھیری رات کے بعد چاند نکلنے سے روشنی ہو جاتی ہے اور بہت سی چھپی ہوئی چیزیں نظر آنے لگتی ہیں، اسی طرح ایک وقت آئے گا کہ یہ اندھیرا چھٹ جائے گا اور آج جو حقیقتیں انسان کو نظر نہیں آ رہی ہیں، وہ سب اُس کی نظروں کے سامنے ہوں گی۔ دُنیا کے بدلتے ہوئے حالات اس دعوے کا ثبوت ہیں اور غور و فکر سے کام لینے کے لئے ان میں بڑی نشانیاں ہیں۔

قدرت کی یہ نشانیاں انسان کے سامنے ہیں، وہ روزانہ اپنی آنکھوں سے انہیں

دیکھ رہا ہے، اللہ کی دی ہوئی عقل اس کی رہنمائی کر سکتی ہے، بشرطیکہ اپنی خواہشات اور باپ دادا کی اندھی تقلید کے دباؤ سے انسان اپنی عقل کو بے کار نہ کر لے۔ انسان اِن سب نشانیوں کو دیکھتا ہے، پھر اسے کیا ہو گیا ہے کہ وہ عقل سے کام نہیں لیتا اور ان حقیقتوں کو تسلیم نہیں کرتا؟ اس کے سامنے اللہ کی کھلی ہوئی آیتیں آ رہی ہیں۔ قرآن ہر بات کو صاف صاف سمجھا رہا ہے، کوئی بات ایسی نہیں جو انسانی عقل میں نہ آ سکتی ہو۔ ہر بات کے لئے دلیل اور ثبوت موجود ہے۔

قدرت کی بے شمار نشانیاں اور دُنیا کا ذرہ ذرہ گواہی دے رہا ہے کہ بات وہی سچ ہے، جو قرآن پیش کر رہا ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ جب قرآن ان کے سامنے پڑھا جاتا ہے، تو ان کی گردنیں اطاعت اور فرماں برداری کے لئے نہیں جھک جاتیں؟

منکروں کی اس رَوِش کی اصل وجہ کچھ اور ہے اور اس کا ذکر اگلی آیتوں میں آ رہا ہے۔ اس مقام پر حکم یہ ہے کہ جو شخص اس آیت کو پڑھے یا سنے وہ سجدہ کرے۔ یہ گویا اس بات کی عملی نشانی ہے کہ یہ سجدہ کرنے والا ان لوگوں سے الگ ہے، جو قرآن سنتے تو ہیں، لیکن نہ اس کی بیان کی ہوئی حقیقتوں کو تسلیم کرتے ہیں اور نہ اس کے احکام پر کان دھرتے ہیں۔

﴿بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُكَذِّبُوْنَ ۝ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ ۝ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝﴾

ترجمہ: ”(نہیں یہ بات نہیں ہے) بلکہ جن لوگوں نے انکار کی روش اختیار کر لی ہے وہ (آخرت کو) جھٹلاتے ہیں۔ اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ یہ جمع کر رہے ہیں۔ تو انہیں ایک دردناک عذاب کی خوش خبری دے دو۔ البتہ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے عمل کئے، ان کے لئے ایسا اجر ہے، جو کبھی ختم ہونے والا نہیں۔“

قرآن ایک ایسی حقیقت پیش کر رہا ہے، جس کی تصدیق کائنات کا ذرہ ذرہ کر رہا ہے، کسی سمجھ دار انسان کے لئے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اس کائنات کی نیرنگیاں دیکھے، دن رات کے تغیرات اس کے سامنے آئیں، سورج اور چاند کی گردشوں پر وہ غور کرے اور پھر یہ نہ مانے کہ یہ سب کام کسی حکیم اور قدرت والے خدا کے کرنے سے ہو رہے ہیں؟ کائنات پر غور کرنے کے بعد آخرت کا انکار کر دینا یا کائنات کے انتظام میں کسی کو اس کا شریک ماننا، سوائے دھاندلی کے اور کیا ہے؟ اس دھاندلی کی اصل وجہ یہ ہے کہ انکار کرنے والوں نے یہ طے کر لیا ہے کہ وہ ہر اس حقیقت کو جھٹلا دیں گے جو قرآن پیش کرے۔

وجہ یہ ہے کہ قرآن زندگی کا جو نقشہ پیش کرتا ہے اور جن راہوں پر انسان کو چلانا چاہتا ہے وہ ان انکار کرنے والوں کی خواہشات اور ان کے ظاہری مفادات کے خلاف ہے۔ یہ اپنی روش کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں، یہ خوب جانتے ہیں کہ قرآن کی تصدیق کر دینے کے بعد انہیں کیا چھوڑنا پڑے گا اور کیا اختیار کرنا پڑے گا، اس لئے قرآن کو جھٹلاتے ہیں، بات سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے اور اگر سمجھ میں آتی بھی ہے، تو یہ اسے رد کر دیتے ہیں۔ یہ ہے اصل وجہ ان کی اس روش کی جو انہوں نے قرآن کے خلاف اختیار کر رکھی ہے۔

لیکن انہیں اچھی طرح یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ان کی تمام کارگزاریاں اللہ تعالیٰ کی نظر میں ہیں، اپنے کارناموں کی بدولت یہ اپنے لئے جو سرمایہ اکٹھا کر رہے ہیں، وہ سب اللہ کے علم میں ہے، ان کا انجام سوائے ناکامی اور بربادی کے اور کچھ نہیں، اس آنے والی اور ہمیشہ رہنے والی زندگی میں اُن کے لئے دکھ ہی دکھ ہے۔ نہایت دردناک عذاب ان کے لئے تیار ہے۔ انہیں اس عذاب کی خبر دے دی جائے۔ انہیں معلوم ہو جائے کہ یہ کس انجام کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں، اس کے بعد بھی اگر یہ اپنی روش نہ بدلیں تو یہ جانیں اور ان کا کام۔

البتہ وہ لوگ جو عقل سے کام لیتے ہیں، کائنات کے انتظام کو آنکھیں کھول کر دیکھتے ہیں اوران حقیقتوں کو تسلیم کر لیتے ہیں، جو قرآن پیش کر رہا ہے۔ وہ انجام کے لحاظ سے ان جھٹلانے والوں سے بالکل مختلف ہیں۔ یہ لوگ خدا کی اتاری ہوئی کتاب اوراس کے بھیجے ہوئے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا مانتے ہیں اور انہیں آخرت کا بھی یقین ہے۔اس یقین کا اثر ان کی زندگیوں میں نمایاں ہے۔ان کی زندگیاں برائیوں سے پاک ہیں، یہ کتاب کی ہدایات پر عمل کرتے ہیں۔ایسے لوگوں کے لئے بہترین انعام ہے، ایسا انعام جو کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ یہ لوگ اس آنے والی اور ہمیشہ رہنے والی زندگی میں پوری طرح سکھ اور آرام سے رہیں گے، ہر قسم کی نعمتیں ان کے لئے ہوں گی اور یہ نعمتیں کبھی ختم نہ ہوں گی۔

یہ سورۃ بھی ان سورتوں میں سے ایک ہے، جن کا اصل موضوع قیامت اور جزائے اعمال ہے۔ جزائے اعمال کا پختہ یقین اور قیامت کے سلسلے میں پیش آنے والے واقعات کا ایسا تصور، جو ہر وقت انسان کے سامنے رہے انسان کی اصلاح کے لئے بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔جن لوگوں نے اپنی اور دوسروں کی اصلاح کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا ہو، ان کے لئے یہ انتہائی ضروری ہے کہ وہ اس نکتے کو سمجھیں اور آخرت کے یقین کو اپنے اصلاحی پروگرام کی سب سے اہم منزل قرار دیں۔

(ماخوذ: آسان تفسیر پارہ ۳۰، جناب عبدالحی صاحب)

تقدیر کا ماننا بھی شرطِ ایمان ہے

ترجمہ حدیث: ”دیلمی سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں (مشہور صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم) حضرت اُبیّ بنِ کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ تقدیر کے متعلق دل میں کچھ خلجان سا پیدا ہو گیا ہے، لہٰذا آپ اس کے متعلق کچھ بیان فرمائیں، شاید اللہ تعالیٰ اس خلجان کو میرے دل سے دور کر دے (اور مجھے اس مسئلہ میں اطمینان نصیب ہو جائے)“ انھوں نے فرمایا: سنو! اگر اللہ تعالیٰ اپنے زمین و آسمان کی ساری مخلوق کو عذاب میں ڈال دے، تو وہ اپنے اس فعل میں ظالم نہ ہوگا اور اگر وہ ان سب کو اپنی رحمت سے نواز دے، تو اسکی یہ رحمت ان کے اعمال سے بہتر ہوگی، (یعنی اُن پر یہ اس کا محض فضل و احسان ہوگا، ان کے اعمال کا واجب حق نہ ہوگا اور سنو! تقدیر پر ایمان لانا اس قدر ضروری ہے کہ) اگر تم اُحد پہاڑ کے برابر سونا راہِ خدا میں خرچ کر دو، تو اللہ کے یہاں وہ قبول نہ ہوگا، جب تک کہ تم تقدیر پر ایمان نہ لاؤ اور تمہارا پختہ اعتقاد یہ نہ ہو، کہ جو کچھ تمہیں پیش آتا ہے، تم کسی طرح اس سے چھوٹ نہیں سکتے تھے، اور جو حالات تم پر پیش نہیں آتے، وہ تم پر آ ہی نہیں سکتے تھے (یعنی جو کچھ ہوتا ہے، وہ سب اللہ کی طرف سے مقدر اور مقرر ہو چکا ہے اور اس مقررہ پروگرام میں ذرّہ برابر تبدیلی بھی ممکن نہیں ہے) اور اگر تم اس کے خلاف اعتقاد رکھتے ہوئے مر گئے، تو یقیناً تم دوزخ میں جاؤ گے۔

حضرت ابن الدیلمی کہتے ہیں کہ حضرت اُبیِّ بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ سننے کے بعد میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو انھوں نے بھی مجھ سے یہی فرمایا، اس کے بعد میں حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو انھوں نے بھی مجھ سے یہی فرمایا، پھر میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو انھوں نے یہی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے طور پر مجھ سے بیان فرمائی۔“

(مسند احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ)

تشریح: تقدیر کے متعلق ایک عام وسوسہ جس کو شیطان کبھی کبھی بعض ایمان والوں کے قلوب میں بھی ڈالتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ جب سب کچھ اللہ ہی کی تقدیر سے ہو رہا ہے، تو پھر دنیا میں کوئی اچھے حال میں اور کوئی برے حال میں کیوں ہے؟ اور آخرت میں کیوں کسی کو جنت اور کسی کو دوزخ میں ڈالا جائے گا؟

اگر کسی صاحبِ ایمان کے دل میں کبھی یہ وسوسہ آئے، تو اسکے دفع کرنے کی آسان اور مختصر تدبیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو سارے عالَم کا خالق و مالک ہونے کی حیثیت سے تمام بندوں اور ساری مخلوقات پر جو کامل اختیار حاصل ہے، اس کی یاد تازہ کرلی جائے اور سوچا جائے کہ ایسا لاشریک مالک الملک اور عدم محض سے وجود میں لانے والا خالق و صانع اپنی جس مخلوق کے ساتھ جو معاملہ بھی کرے، بلاشبہ وہ اس کا حقدار ہے۔ وہ سب کو عذاب میں مبتلا کرے، تو کسی قانون سے اس کو ظالم نہیں کہا جاسکتا اور اگر سب کو رحمت سے نواز دے، تو یہ رحمت محض اس کی بخشش ہی ہوگی، کیونکہ جو نیکوکار نیک اعمال کرتے ہیں، ان کی توفیق دینے والا اور اعمال کرانے والا بھی تو وہی ہے۔

دیلمی رحمۃ اللہ علیہ بحمد اللہ چونکہ سچے مومن تھے اور اللہ تعالیٰ کی اس شان پر ایمان واعتقاد رکھتے تھے، اس لئے ان صحابۂ کرام نے اسی کی یاد دہانی کے ذریعہ ان کے

وسوسہ کا علاج کیا اور انھیں یہ بھی جتلا دیا کہ تقدیر پر ایمان و اعتقاد اتنا ضروری ہے کہ اگر کوئی شخص اس عقیدے کے بغیر پہاڑ کے برابر سونا بھی راہِ خدا میں خرچ کرے، تو اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول نہیں اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہی ہوگا۔

ترجمۂ حدیث: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ہم لوگ (مسجد نبوی میں بیٹھے) قضا و قدر کے مسئلہ میں بحث مباحثہ کر رہے تھے، کہ اسی حال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لے آئے (اور ہم کو یہ بحث کرتے دیکھا) تو آپ بہت برافروختہ اور غضبناک ہوئے، یہاں تک کہ چہرۂ مبارک سرخ ہوگیا اور اس قدر سرخ ہوا کہ معلوم ہوتا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رخساروں پر انار نچوڑ دیا گیا ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کیا تم کو یہی حکم کیا گیا ہے؟ کیا میں تمہارے لئے یہی پیام لایا ہوں (کہ تم قضاء وقدر جیسے اہم اور نازک مسئلوں پر بحث کرو؟) خبردار! تم سے پہلی اُمتیں اُسی وقت ہلاک ہوئیں، جبکہ انھوں نے اِس مسئلہ میں حجت و بحث کو اپنا طریقہ بنالیا۔ میں تم کو قسم دیتا ہوں، میں تم پر لازم کرتا ہوں کہ اس مسئلہ میں ہرگز حجت اور بحث نہ کرنا۔ (ترمذی)

تشریح: قضاء وقدر کا مسئلہ بلاشبہ مشکل اور نازک مسئلہ ہے۔ لہٰذا مومن کو چاہئے کہ اگر یہ مسئلہ اس کی سمجھ میں نہ آئے، تو بحث اور حجت نہ کرے، بلکہ اپنے دل و دماغ کو اس پر مطمئن کرلے کہ اللہ کے صادق و مصدوق رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسئلہ کو اسی طرح بیان فرمایا ہے، لہٰذا ہم اس پر ایمان لائے۔

ترجمۂ حدیث: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی تخلیق سے پچاس ہزار برس پہلے تمام

مخلوقات کی تقدیریں لکھ دی ہیں، اور فرمایا کہ ''اُس کا عرش پانی پر تھا۔''

(مسلم)

تشریح: اس حدیث میں چند چیزیں غور طلب ہیں:

اوّل یہ کہ اللہ تعالیٰ کے تقدیر لکھنے سے کیا مراد ہے؟ ظاہر ہے اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ جس طرح ہم انسان ہاتھ میں قلم اور کاغذ لے کر یا تختی پر کچھ لکھتے ہیں، ایسے ہی اللہ تعالیٰ نے لکھا ہو۔ ایسا خیال کرنا اللہ تعالیٰ کی شانِ اقدس سے ناواقفی ہے۔ دراصل اللہ تعالیٰ کے افعال و صفات کی حقیقت اور کیفیت کے ادراک سے ہم قاصر ہیں اور چونکہ اس کے لئے الگ کوئی زبان اور لغت نہیں ہے، اس لئے ہم مجبوراً اِنھیں الفاظ سے اُس کے افعال وصفات کی تعبیر کرتے ہیں جو دراصل ہمارے افعال و صفات کے لئے وضع کیے گئے ہیں، ورنہ اُس کے اور ہمارے افعال و صفات کی حقیقت اور کیفیت میں اتنا ہی فرق ہے جتنا اُس کی عالی ذات اور ہماری ذاتوں میں ہے۔

دوسری بات اس حدیث کے متعلق یہ بھی ملحوظ رہنی چاہیے کہ پچاس ہزار برس سے مُراد بہت طویل زمانہ بھی ہوسکتا ہے۔ حدیث کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کا عرش پانی پر تھا'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرش اور پانی اُس وقت پیدا کیے جاچکے تھے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے تحریر فرمایا ہے کہ: جس طرح ہماری قوتِ خیالیہ میں ہزاروں چیزوں کی صورتیں اور ان کے متعلق معلومات جمع رہتی ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے عرش کی قوتوں میں سے کسی خاص قوت میں (جس کو ہماری قوت خیالیہ کے مشابہ سمجھنا چاہیے) تمام مخلوقات اور ان کے تمام احوال اور حرکات وسکنات کو، غرض جو کچھ عالمِ وجود میں آنے والا ہے، ان سب کو عرش کی اس قوت میں ثبت فرما دیا۔ گویا دنیا کے پردے پر جو کچھ ہورہا ہے، وہ سب عرش کی اس قوت میں اسی طرح

موجود و محفوظ ہے، جس طرح ہمارے خیال میں لاکھوں صورتیں اور ان کے متعلق معلومات ہوتی ہیں۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمام مخلوقات کی تقدیر لکھنے سے یہی مراد ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے تقدیرِ الٰہی کے مختلف مدارج اور مظاہر کو بہت سلجھا کر بیان فرمایا ہے۔ ان کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

تقدیر کے مختلف مدارج

1. ازل میں جبکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کچھ بھی نہ تھا، زمین و آسمان، ہوا، پانی، عرش و کرسی میں سے کوئی چیز بھی پیدا نہ کی گئی تھی، تو اس وقت بھی اللہ تعالیٰ کو بعد میں پیدا ہونے والی ساری کائنات کا پورا پورا علم تھا۔ پس اس دورِ ازل ہی سے اس نے ارادہ اور فیصلہ کیا کہ اس تفصیل اور ترتیب کے مطابق جو میرے علم میں ہے، میں عالَم کو پیدا کروں گا اور اس میں یہ واقعات پیش آئیں گے۔ الغرض آئندہ وجود میں آنے والے عالَم کے متعلق جو تفصیل و ترتیب اُس کے ازلی علم میں تھی، اُس نے ازل ہی میں طے فرمایا کہ میں ان سب کو وجود میں لاؤں گا۔ پس یہ طے فرمانا ہی تقدیر کا پہلا درجہ اور پہلا ظہور ہے۔

2. پھر ایک وقت آیا جب کہ پانی اور عرش پیدا کئے جا چکے تھے، مگر زمین و آسمان پیدا نہ ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کی تقدیریں پہلی ازلی تقدیر کے مطابق لکھ دیں۔ (جس کی حقیقت حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ ہے کہ: عرش کی قوتِ خیالیہ میں تمام مخلوق کی تفصیلی تقدیر منعکس کردی، اور اس طرح عرش اس کا حامل ہوگیا)۔ یہ تقدیر کا دوسرا درجہ اور دوسرا ظہور ہوا۔

۳ پھر ہر انسان کی تخلیق جب رحمِ مادر میں شروع ہوتی ہے اور تین چلّے گزر جانے پر جب اس میں روح ڈالنے کا وقت آتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کا مقرر کیا ہوا فرشتہ اللہ تعالیٰ ہی سے علم حاصل کر کے اس کے متعلق ایک تقدیری نوشتہ مرتب کرتا ہے جس میں اس کی مدّتِ حیات، اعمال، رزق اور اس کے نیک بخت یا بد بخت ہونے کی تفصیل ہوتی ہے۔ یہ نوشتۂ تقدیر کا تیسرا درجہ اور تیسرا ظہور ہے۔

۴ پھر انسان جب کوئی کام کرنا چاہتا ہے، تو اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے وہ اس کو کرتا ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں فرمایا کہ انسانوں کے سب دل اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہیں اور وہ جدھر چاہتا ہے، انھیں پھیرتا ہے۔ پس یہ تقدیر کا چوتھا درجہ اور چوتھا ظہور ہے۔

اگر اس تفصیل کو ملحوظ رکھا جائے تو تقدیر کے سلسلہ کی مختلف احادیث کے مطالب و محامل کے سمجھنے میں انشا اللہ مشکل پیش نہ آئے گی۔

مسئلہ تقدیر کے متعلق بعض شبہات کا ازالہ

بہت سے لوگوں کو کم فہمی یا نافہمی سے تقدیر کے متعلق شبہات ہوتے ہیں۔ اس مسئلہ میں مندرجہ ذیل تین اشکال مشہور ہیں:

۱ ...... یہ کہ دنیا میں اچھا یا برا جو کچھ ہوتا ہے، اگر یہ سب اللہ ہی کی تقدیر سے ہے اور اللہ تعالیٰ ہی نے اس کو مقدر کیا ہے تو پھر اچھائیوں کے ساتھ تمام برائیوں کی ذمہ داری بھی (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ پر آئے گی۔

۲ ...... یہ کہ جب سب کچھ پہلے سے منجانب اللہ مقدر ہو چکا ہے، اور اس کی تقدیر اٹل ہے، تو بندے اسی کے مطابق کرنے پر مجبور ہیں، لہٰذا انھیں کوئی جزا و سزا نہ ملنی چاہئے۔

۳ ...... شبہ یہ کیا جاتا ہے کہ جو کچھ ہونا ہے، جب وہ سب پہلے سے مقدر ہی

ہو چکا ہے اور اسکے خلاف کچھ ہو ہی نہیں سکتا، تو پھر کسی مقصد کے لئے کچھ کرنے دھرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ لہٰذا دنیا یا آخرت کے کسی کام کے لئے محنت اور کوشش فضول ہے۔

لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ تینوں شبہات تقدیر کے غلط اور ناقص تصور سے پیدا ہوتے ہیں۔

عرض کیا جا چکا ہے کہ اللہ کی تقدیر اُس کے علمِ ازلی کے مطابق ہے۔ اس کارخانۂ عالَم میں جو کچھ، جس طرح اور جس صفت کے ساتھ اور جس سلسلہ سے ہو رہا ہے، وہ بالکل اُسی طرح اور اُسی صفت اور اُسی سلسلہ کے ساتھ اُس کے علمِ ازلی میں تھا اور اُسی طرح اللہ تعالیٰ نے اُس کو مقدر فرما دیا ہے۔

ہم میں سے جو شخص بھی اپنے اعمال و افعال پر غور کرے گا، وہ بغیر کسی شک و شبہ کے اِس حقیقت کو محسوس کرے گا کہ اس دنیا میں ہم جو بھی اچھے اور برے عمل کرتے ہیں، وہ اپنے ارادے اور اختیار سے کرتے ہیں۔ ہر کام کرنے کے وقت اگر ہم غور کریں تو بدیہی اور یقینی طور پر محسوس ہوگا کہ ہم کو یہ قدرت حاصل ہے کہ چاہیں تو اس کو کریں اور چاہیں تو نہ کریں۔ پھر اِس قدرت کے باوجود ہم اپنے خداداد ارادے اور اختیار سے کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں اور اسی فیصلے کے مطابق ہمارا عمل ہوتا ہے۔

پس اِس عالَم میں جس طرح ہم اپنے ارادے اور اختیار سے اپنے تمام کام کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کو ازل میں اِسی طرح اِن کا علم تھا۔ پھر اِسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو مقدر فرما دیا اور اِس پورے سلسلے کے وجود کا فیصلہ فرما دیا۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے صرف ہمارے اعمال ہی کو مقدر نہیں فرمایا ہے، بلکہ جس ارادے اور اختیار سے ہم عمل کرتے ہیں، وہ بھی تقدیر میں آچکا ہے، گویا تقدیر میں صرف یہی نہیں ہے کہ فلاں شخص فلاں اچھا یا برا کام کرے گا، بلکہ تقدیر میں یہ پوری بات ہے کہ فلاں شخص اپنے ارادے اور اختیار سے ایسا کرے گا۔ پھر اس سے یہ نتائج پیدا ہوں گے۔ پھر اس کو یہ

جزا یا سزا ملے گی۔

بہرحال تقدیر نے اس خود اختیاری اور خود ارادیت کو باطل اور ختم نہیں کیا، بلکہ اس کو اور زیادہ ثابت اور مستحکم کردیا ہے۔ لہٰذا تقدیر کی وجہ سے نہ تو ہم مجبور ہیں اور نہ ہمارے اعمال کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر ہوتی ہے۔

پس یہ خیال کرنا کہ تقدیر میں جو کچھ ہے، وہ خود بخود مل جائے گا اور اس بنا پر عالمِ اسباب کی کوششوں اور تدبیروں سے دست بردار ہونا دراصل تقدیر کی حقیقت سے ناواقفی ہے۔

ترجمہ حدیث: ''حضرت ابوخزامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ کیا ارشاد ہے اس بارے میں کہ جھاڑ پھونک کے وہ طریقے جن کو ہم دکھ درد میں استعمال کرتے ہیں یا دوائیں جن سے ہم اپنا علاج کرتے ہیں یا مصیبتوں اور تکلیفوں سے بچنے کی وہ تدبیریں جن کو ہم اپنے بچاؤ کے لئے استعمال کرتے ہیں، کیا یہ چیزیں اللہ کی قضاو قدر کو لوٹا دیتی ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے ہیں۔'' (مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ)

تشریح: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم جن مقاصد کے حاصل کرنے کے لئے جو تدبیریں اور کوششیں کرتے ہیں اور اس سلسلے میں جن اسباب کا استعمال کرتے ہیں، وہ سب بھی اللہ کی قضاوقدر کے ماتحت ہیں، گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی مقدر اور مقرر ہوتا ہے کہ فلاں شخص پر فلاں بیماری آئے گی اور فلاں قسم کے جھاڑ پھونک یا فلاں دواؤں کے استعمال سے وہ اچھا ہو جائے گا۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نہایت مختصر دو لفظی جواب سے مسئلہ تقدیر کے متعلق بہت سے شبہات اور سوالات کا جواب ہو جاتا ہے۔

ترجمۂ حدیث: حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے ہر ایک کا ٹھکانہ جنت کا اور دوزخ کا لکھا جا چکا ہے۔ (مطلب یہ ہے کہ جو شخص دوزخ یا جنت جہاں بھی جائے گا، اس کی وہ جگہ پہلے سے مقدر اور مقرر ہو چکی ہے)۔ صحابہ نے عرض کیا تو کیا ہم اپنے اس نوشتۂ تقدیر پر بھروسہ کر کے نہ بیٹھ جائیں اور سعی و عمل چھوڑ نہ دیں؟ (مطلب یہ کہ جب سب کچھ پہلے سے طے شدہ اور لکھا ہوا ہے تو پھر ہم سعی و عمل کی دردسری کیوں مول لیں؟)

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''نہیں، عمل کئے جاؤ، کیونکہ ہر ایک کو اُسی کی توفیق ملتی ہے جس کے لئے وہ پیدا ہوا ہے، پس جو کوئی نیک بختوں میں سے ہے تو اس کو سعادت اور نیک بختی کے کاموں کی توفیق ملتی ہے اور جو کوئی بدبختوں میں سے ہے تو اس کو شقاوت اور بدبختی والے اعمالِ بد ہی کی توفیق ملتی ہے۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پاک کی یہ آیت تلاوت فرمائی:''

﴿ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰی وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی وَکَذَّبَ بِالْحُسْنٰی فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰی ﴾ (اللیل)

ترجمہ: ''جس نے راہِ خدا میں دیا اور تقویٰ اختیار کیا اور اچھی بات کی تصدیق کی (یعنی دعوتِ اسلام کو قبول کیا) تو اس کو ہم چین و راحت کی زندگی، یعنی جنت حاصل کرنے کی توفیق دینگے، اور جس نے بخل سے کام لیا اور مغرور و بے پروا رہا، اور اچھی بات کو یعنی دعوتِ ایمان کو جھٹلایا، تو اس کے واسطے ہم تکلیف اور دشواری والی زندگی (یعنی دوزخ) کی طرف چلنا آسان کر دیں گے۔'' (بخاری و مسلم)

تشریح: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ اگرچہ ہر شخص کے لئے اس کا آخری ٹھکانہ دوزخ یا جنت پہلے سے مقرر ہو چکا ہے، لیکن اچھے یا برے اعمال سے وہاں تک پہنچنے کا راستہ بھی پہلے سے مقدر ہے، اور تقدیرِ الٰہی میں یہ بھی طے ہو چکا ہے کہ جو جنت میں جائے گا، وہ اپنے فلاں فلاں اعمالِ خیر کے راستے سے جائے گا اور جو جہنم میں جائے گا، وہ اپنی فلاں فلاں بداعمالیوں کی وجہ سے جائے گا۔ پس جنتیوں کے لئے اعمالِ خیر اور دوزخیوں کے لئے اعمالِ بد بھی مقدور و مقرر ہیں۔

الغرض اگر تقدیر کی پوری حقیقت سامنے رکھ لی جائے، تو ان شا اللہ کسی قسم کا کوئی شبہ پیدا نہیں ہوگا۔

﴿وَاللّٰهُ يَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ۝﴾

(ماخوذ۔ معارف الحدیث جلد اوّل تالیف مولانا محمد منظور نعمانیؒ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿وَاٰتِ ذَا الۡقُرۡبٰى حَقَّهٗ وَالۡمِسۡكِيۡنَ وَابۡنَ السَّبِيۡلِ وَلَا تُبَذِّرۡ تَبۡذِيۡرًا ۝﴾ (سورہ بنی اسرائیل:۲۶)

ترجمہ: "اور دے قرابت والے کو اس کا حق اور محتاج کو اور مسافر کو اور مت اڑا بے جا۔"